شالامار باغ

بحسنِ سعی کارپردازان پیسہ اخبار

محمد الدین فوق

خادم التعلیم برقی پریس لاہور

ہماری اپنی مطبوعات

(از تصنیفات منشی محمد الدین صاحب - فوق)

تاریخ حُریت اسلام جسکو پنجاب
کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم - ڈائرکٹر سررشتہ
تعلیم بھوپال محکمہ تعلیم بہاولپور اور کئی قومی و
اسلامی مدارس کے علاوہ ملک کے نامی اہل علم ڈاکٹر
سر محمد اقبال - خان بہادر شیخ عبدالقادر
بیرسٹر ایٹ لا سابق جج ہائیکورٹ اور محترمہ
خدیجہ بیگم صاحبہ ایم اے وظیفہ خوار انگلستان
ایبٹ آباد نے عہد حاضرہ کی اسلامی تالیفات
میں مفید ترین اسلامی تاریخ قرار دیا ہے ۳؍

حیات مولانا روم حضرت مولانا
جلال الدین رومی کے حالات زندگی - ان کی
صوفیانہ مجلسوں اور حقائق و معارف کی تذکروں
نے اسلام کی جو خدمت کی ہے اور انکی مثنوی نے
قرآن پہلوی کا جو درجہ حاصل کیا ہے اس
کی کیفیت - قیمت - - - - ۱۲؍

شمس تبریز مولانا روم کے مرشد کامل
کے حالات جن کے متعلق خود مولانا کا ارشاد
ہے:- مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد
قیمت صرف - - - ۸؍

دیوان حافظ کی تاریخی فالیں
جسمیں خواجہ حافظ شیرازیؒ کے وہ اشعار
معہ ترجمہ درج ہیں جو مختلف ممالک میں
مختلف لوگوں نے جن میں ایران و ہندوستان کے
بادشاہ بھی شامل ہیں بطور فال و شگون استعمال
کئے ہیں - ابتدا میں خواجہ حافظ کی مختصر سی
لائف بھی ہے - قیمت صرف - - ۱؍۴

شالامار باغ نو ترمیم بلکہ سلسلہ جدید کا
پہلا ایڈیشن جسمیں ہندوستان کے دیگر باغہائے
شالامار کے حالات بھی بڑی تفتیش سے درج ہیں
اس کے مطالعہ سے شائقین تاریخ کو تاریخی آگاہی
قومی مرثیہ پڑھنے والوں کو حسرت کا دفتر اور
اہل بصیرت کو ایک پُر اثر سبق حاصل ہوتا ہے ۸؍

تذکرہ خواتین دکن بڑے دلچسپ اور
ولولہ انگیز حالات - - - ۸؍

تذکرۃ العلماء والمشائخ پنجاب و
لاہور کے ان بوریا نشینوں کے حالات جو علمی و
صوفیانہ حلقوں میں سعدی جامی اور بایزید
ہو کر چمکے - - - ۱۰؍

یادِ رفتگاں یا تذکرہ صوفیائے لاہور ۱۲؍

المشتہر ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور

ظفر برادرس تاجرانِ کتب ظفر منزل لاہور کا سلسلہ کتب ۱۱

تاریخ

شالامار باغ

جس میں

لاہور کے شاہی شالامار باغ اس کے شاہی ایوانات اور شاہی جلسہ گاہوں اور سیر گاہوں کی اثر پذیر کیفیت کے علاوہ یہ بتایا گیا ہے۔ کہ شاہانِ مغلیہ کے بعد نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں۔ سکھ حاکمانِ لاہور کی بے استقلال حکومت اور رنجیت سنگھ اور اس کی اولاد نے اس عدیم النظیر باغ اور اس کے ایوانات کے ساتھ کس قسم کا بے رندانہ سلوک کیا ہے۔ اسی ضمن میں کمال محنت و تفتیش سے کشمیر دہلی اور پنجاب کے آٹھ اور باغات کے شالامار کے دلچسپ کوائف اور حضرت مادھو لعل حسین کے سوانح حیات اور دنیا چند کے تاریخی حالات نہایت دلکش نادر اور حیرت انگیز پیرایہ میں درج ہیں۔

مرتبہ

محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور

۱۹۲۴ء

سلسلہ جدید ایڈیشن اول — قیمت فی جلد ۸؍

مطبوعہ لاہور پرنٹنگ پریس لاہور باہتمام منشی رحیم بخش صاحب پرنٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

"سیر شالامار باغ" کا سب سے پہلا ایڈیشن میں نے ۲۰ ر فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو لکھا۔ اس وقت اس کا حجم ۲۰ صفحوں سے زیادہ نہ تھا۔ اور یہ صرف دو تین دن تک تواریخ ہائے لاہور وغیرہ کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ چونکہ نئی بات اور نئی چیز تھی اخبارات نے اس پہ حوصلہ افزا ریویوز لکھے اور مؤلف کی جدت طرازی کی داد دی۔ پبلک نے بھی قدردانی کی اور میلۂ شالامار باغ (اخیر مارچ سنہ ۱۹۱۰ء) کے ایام ہی میں یہ مختصر سا پمفلٹ ختم ہو گیا۔ اس ایڈیشن کے متعلق میرے دوست قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل آف گولیکی حال ایڈیٹر "تشحیذ الاذہان" قادیان نے دو تاریخی قطعات لکھے۔ ایک ہجری ہے جس کا آخری شعر حسب ذیل ہے ؎

ہوئی اکمل کو جب تاریخ کی فکر — کہا فی الفور ہے تاریخ اکمل

دوسرا قطعہ سنہ عیسوی میں تھا جس کے طویل اشعار میں سے صرف آخری شعر لکھا جاتا ہے ؎

از سر اخلاص یہ تاریخ اکمل نے کہی — فوق نے چھپوایا اچھا حال شالامار باغ

نقش ثانی میں نے ۲ ر فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو ترتیب دیا۔ یہ بہرحال نقش اول سے بہتر تھا۔ اس میں قریباً ان تمام عمارات[1] کا ذکر تھا جو شالامار باغ کو جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف آتی ہیں۔ اور اپنے بلند گنبدوں عالیشان دروازوں اور شکستہ و بوسیدہ

---

[1] مثلاً بدھو کا آوا۔ گلابی باغ۔ مقبرہ و ڈیوڑھی نواب علی مردان خاں۔ مقبرہ نواب خان دوران۔ مقبرہ سرو والا۔ مقبرہ حضرت ایشاں۔ بیگم پورہ اور لاہور کے بعض اور تاریخی باغات کے حالات (اب ان سب کا ذکر سرگذشت لاہور میں درج ہوگا) +

دیواروں اور ٹوٹے ہوئے محرابوں اور چبوتروں اور اپنی عجیب و حیرت انگیز صنعت کاری کی وجہ سے ہر راہرو ہر ناظر اور ہر صاحبدل کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ نقش ثانی میں اس مختصر سی کتاب کا حجم بہت سے اضافہ کی وجہ سے ۸۰ صفحہ سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ یہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اخبارات کے علاوہ پنجاب اور یو۔ پی کے نامی شعرا نے قطعات تاریخ بھی لکھے جن میں ڈاکٹر سر محمد اقبال[1] صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا لاہور کا قطعۂ تاریخ حسب ذیل ہے

حسن سعئ فوق را صد مرحبا ہست ہر سطر کتابش دلربا
از سر نازش پئے تاریخ او مے سزد تصویر باغ جانفزا
۱۹۰۰ء

منشی محمد احسان علی خاں صاحب احسانؔ[2] شاہجہانپوری نے جن کا افسوس ہے کچھ عرصہ سے انتقال ہو چکا ہے اپنے ۲۲ فروری سنہ ۱۹۰۰ء کے خط میں تین شعروں کا حسب ذیل قطعہ لکھ کر ارسال فرمایا

فوق نے تحریر کی تاریخ شالامار باغ ہر ورق میں ہے شباہت صفحۂ گلزار کی
دوسری بار اسکے چھپنے کا ہوا ہے اہتمام خوبیاں ظاہر ہیں سب حاجت نہیں اظہار کی
سیر اول کر چکے احسان لیکن بہر سال اب بہار حال دیکھو باغ شالامار کی۔
۱۹۰۰ء

سنہ ۱۹۰۲ء میں بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے میں نے تیسرا ایڈیشن چھاپا۔ اور اس کے بعد حکیم رام کشن صاحب اس کو قریباً ہر دوسرے تیسرے سال چھاپتے رہے اور اب تک غالباً اس کتاب کے چودہ پندرہ ایڈیشن چھاپ چکے ہیں لیکن نہ کبھی انہوں نے نیا ایڈیشن چھاپنے کے لئے مجھے مطلع کیا اور نہ مجھے اس کے چھپنے کی کبھی اطلاع ہو سکی

---

[1] اس زمانہ میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربک پروفیسر تھے۔ اور ایم۔ اے کے سوا کوئی ڈگری یا خطاب آپ کے نام کے ساتھ نہ تھا۔ اور پروفیسر اقبال کے نام سے مشہور تھے۔

[2] حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی مرحوم کے نامور بلکہ قابل فخر شاگردوں میں سے تھے

اس طرح سنہ ۱۹۰۱ء کی تصنیف میں سنہ ۱۹۲۲ء تک کوئی بھی اضافہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ کثرت مطالعہ نے جو نئے حالات بتائے تھے ان کی وجہ سے ہمیشہ اس میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت رہتی تھی ؎

بیس سال کے بعد سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک خط نے مجھے سیر شالا مار باغ پر پھر ایک نظر ڈالنے کی تحریک کی۔ یہ خط میرے دوست مسٹر محمد منیر قریشی بی اے لائبریرین آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ شملہ نے مجھے ۱۱ ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء کو شملہ سے لکھا جبکہ میں گلگشت کشمیر میں مصروف تھا۔ اس خط کا جو حصہ شالا مار باغ کے متعلق ہے اُس کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے :۔ "۱۰ ستمبر حال کے پرچہ (انڈین) آرکیالوجیکل میں جو سر رچرڈ ٹمپل کی ادارت میں چھپتا ہے۔ اور جس میں ہندوستان پر مختلف عالموں کے مضامین چھپتے ہیں۔ ایک فہرست ان کتب کی جو ہندوستان کی اسلامی عمارات کے متعلق معتبر تاریخی اور روایتی معلومات بہم پہونچاتی ہیں۔ چھپی ہے۔ اور اس فہرست میں شہر لاہور کے تحت میں جن دس چیدہ کتابوں کے نام چھپے ہیں اُن میں ہندوستانی مصنفین میں سے صرف دو صاحبوں کے نام اور انکی تصانیف کا ذکر ہے۔ اول تو سید محمد لطیف صاحب اور ان کی تاریخ لاہور کا۔ دوسرے جناب کا اور جناب کی تصنیف سیر شالا مار باغ کا۔ باقی آٹھ تصنیفات ڈاکٹر ووگل۔ ایبنڈ ریوز۔ ایٹون۔ ہنری کوپ۔ کپلنگ۔ اور ٹامسن صاحب سابق چیف سکرٹری پنجاب کی ہیں۔ اس امتیاز و اعزاز پر آپ جسقدر فخر کریں بجا ہے۔ اس فہرست کی ترتیب مصر سے ایک انگریز بنام "کپٹن کرسول" کر رہے ہیں۔ اور وہی اسے اس رسالہ میں چھپوا رہے ہیں" ؎

اس خط کے بعد مجھے "سیر شالا مار باغ" کے مطالعہ کی از سر نو ضرورت محسوس ہوئی اور جب میں نے اپنی سنہ ۱۹۰۱ء کی تصنیف کو سنہ ۱۹۲۲ء میں دیکھا تو وہ نئے معلومات اور جدید مطالعہ اور نئی ترتیب و تنظیم کے خیالات کے سامنے بالکل بے حقیقت نظر آئی۔

نومبر سنہ ۱۹۲۲ء اور جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کے اکثر ایام نئے حالات دریافت

کرنے کے لئے میں نے شالامار باغ کے علاوہ لاہور کے اور کئی مقامات بلکہ مضافات میں گذارے ۔

شاعر کہتا ہے۔ "دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں گئی" اور پھر نتیجہ اور انجام بتاتا ہے۔ "عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں گئی"۔ لیکن ان ایام میں میری یہ حالت تھی کہ دن تو آثارِ قدیمہ مقابر عالیہ مساجد واسعہ اور عمارات رفیعہ کی گرداوری میں جو جسم کو تھکاتی دل کو زندہ اور روح کو تازہ رکھتی تھی۔ کٹتا تھا۔ اور رات ان کتابوں کے مطالعہ میں بسر ہوتی تھی جو زبان بے زبانی سے لاہور کی تاریخی دلچسپیاں اور شاہان سلف کا ذکر محمود اور لٹیرے بدھو ڈاکو حاکموں کی سنگدلی و بے دردی کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ بعض اوقات رات کے دو دو بجے تک میرے پلنگ کے پس و پیش کتابوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ ترمیم و تنسیخ یہاں تک ہوئی۔ اور نئے معلومات و مطالعہ نے اضافہ اس قدر کیا۔ کہ کتاب کی شکل ہی بدل گئی۔ کتاب کا حجم جو پہلے ۸۰ صفحہ تک تھا۔ اب بڑی تقطیع کے تین سو صفحہ تک پہنچ گیا ۔

اب یہ کتاب صرف شالامار باغ کی تاریخ ہی نہیں تھی۔ بلکہ لاہور کے قدیم باغات پرانے مکانات۔ مزارات اور مذہبی مقامات کی جن میں سے اکثروں کا یہ حال ہے ع کہ ان کی داستاں تک بھی نہیں ہے داستانوں میں۔ عبرت انگیز اور آنکھوں سے آنسو نہیں خون رلا دینے والی سرگذشت اور دردناک اور الم افزا تصویر تھی ۔

اس ترتیب و تنظیم میں قریباً ۲ ماہ صرف ہوئے۔ چونکہ کتاب کا حجم بہت زیادہ ہو گیا تھا بلکہ آثار قدیمہ کے حالات کی وجہ سے نفس مضمون ہی بدل چکا تھا۔ اور تاریخ شالامار باغ جو اصل بنیاد تھی اس کتاب کا ایک ضمیمہ معلوم ہوتی تھی۔ اسلئے شالامار باغ کی تاریخ کا حصہ اس میں سے الگ کر لیا گیا جس میں حسب ذیل مضامین کا اندراج ہے :-

(۱) تاریخ شالامار باغ لاہور

(۲) لاہور کے علاوہ دیگر مقامات کے شالامار باغ

(۳) حضرت مادھو لال حسین کے سوانحات عمری جن کے عرس کی وجہ سے یہ میلہ مبلہ

چراغاں اور میلۂ شالامار باغ کہلاتا ہے ٭

(۴) باغبانپورہ کے تاریخی حالات جہاں مزار حضرت مادھو لال حسین واقع ہے۔ اور جس کے بانی کی اولاد کے قبضہ میں شاہجہان کے زمانہ سے اب تک شالامار باغ کی عنانِ خدمت و حفاظت چلی آتی ہے ٭

۱۹۲۳ء کے ایڈیشن میں شالامار باغ کے متعلق علاوہ چشم دید حالات کے جن کتابوں اور تاریخوں سے مدد لی گئی ہے اُن کے نام حسب ذیل ہیں :-

۱- تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ جج محمد لطیف مرحوم مطبوعہ ۱۸۹۲ء
۲- سفرنامہ ولیم مورکرافٹ انگریزی مطبوعہ ۱۸۳۷ء
۳- تحقیقات چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی ایڈیشن اول مطبوعہ ۱۸۶۷ء
۴- تاریخ محمد شاہی فارسی قلمی مصنفہ منشی خوشحالچند سابق سال تصنیف ۱۱۴۲ھ
۵- خلاصۃ التواریخ فارسی قلمی مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی سال تصنیف ۱۱۰۸ھ عہد عالمگیر ٭
۶- تاریخ پنجاب اردو خان بہادر جج محمد لطیف مطبوعہ ۱۸۸۹ء ٭
۷- تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لال مطبوعہ ۱۸۸۴ء
۸- تاریخ ہند مصنفہ مولانا ذکاء اللہ جلد ششم و ہفتم و ہشتم مطبوعہ ۱۸۹۸ء
۹- مثنوی بے نظیر غیر مطبوعہ مصنفہ ظفر خاں احسن شاہجہانی گورنر کشمیر ٭
۱۰- لاہور کے بعض اخبارات و رسائل ٭

دوسرے ٹکڑہ کا نام عصرِ گذشتہ لاہور ہے۔ اس کا بہت سا حصہ لکھا جا چکا ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی اور موت نے مہلت دی اور حالات و واقعات نے اجازت دی تو اس میں ابھی بہت کچھ اضافہ کی توقع اور گنجایش ہے ٭

لاہور عالم وجود میں آنے کے بعد جن حوادثات و سوانحات سے گذرتا رہا ہے اور مغل حکومت کے زرین عہد میں جو عروج و اقتدار اس نے حاصل کیا ہے۔ اور زوال مغلیہ کے بعد اس عروس البلاد پر اور اس کی عالیشان فلک نما تعمیرات اور ارم تخمیر

باغات اور اس کے امن پسند باشندوں پر جو تباہی و بربادی قریباً ایک سو سال
آتی رہی ہے اس کا دردناک ذکر ایک دفعہ تو دلوں کو ہلا دیگا۔ اور فاعتبروا یا
اولی الابصار کا عبرت آگین منظر پیش کریگا۔ غرض لاہور کے آثار قدیمہ کی یہ
سرگذشت مرمٹوں کا نشان بتانے اور عبرت و بصیرت کا سبق دینے کے لیے خضر راہ
کا کام دیگی۔

۱۳ جولائی[1] ۱۹۲۳ء مطابق ۲۷
ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ موافق ۲۹ ہاڑ
۱۹۸۰ب۔ یوم جمعۃ المبارک

محمد الدین فوق لاہور

---

[1] یہ کتاب بعض وجوہات سے جولائی ۱۹۲۳ء کی بجائے مارچ ۱۹۲۵ء میں چھپی۔

شالامار باغ لاہور

تعمیرِ باغ کی مختلف روایتیں اس مشہور و مقبول عام باغ کی تعمیر کے متعلق[1] مختلف روایتیں نظر سے گذری ہیں۔ جن میں سے دو قابل ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ شاہجہان نے ایک رات شالامار میں قیام کیا۔ وہاں ایک خواب دیکھا جس میں ایک باغ نظر آیا جو بہشت بریں کا نمونہ تھا۔ اس باغ میں سونے کے پھل۔ سنگ مرمر کے فوارے زمرد کے درخت اور دلکش حوض تھے۔ شاہجہان نے بیدار ہو کر نواب علیمردان خان کو اپنا خواب سنایا۔ اور حکم دیا۔ کہ کوئی اچھی سی جگہ دیکھ کر میرے خواب کے مطابق ایک باغ تعمیر کیا جائے۔ نواب علیمردان خان نے بادشاہ کے ارشاد کے مطابق ایک ایسے باغ کی بنیاد رکھی جس میں بہشت کے سات طبقوں کی طرح سات تختے تجویز کئے۔ اور جن میں عالیشان محلات و ایوانات تیار کرائے۔

دوسری[2] روایت یہ ہے۔ کہ بادشاہ لاہور میں تھا۔ علیمردان نے عرض کیا۔ فدوی کے ہمراہ ایک شخص ہے کہ وہ نہروں کے بنانے اور آبپاشی کے فن میں کمال رکھتا ہے۔ اور وہ عرض کرتا ہے کہ اس مقام سے جہاں آب راوی کوہستان سے نکل کر ہموار زمین پر بہتا ہے۔ ایک نہر نکال کر جو لائے لاہور تک لائیگا جس سے کھیتوں اور باغوں میں آبپاشی ہوگی۔ بادشاہ نے منظور کیا اور نہر کی کھدائی اور باغ کے احداث کئے جانے کے احکام صادر ہو گئے۔ جن لوگوں کو شاہجہان کے شوق عمارت و باغات کا حال معلوم ہے وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ روایت اول محض سنی سنائی بات ہے۔ دوسری روایت البتہ

---

[1] از تحقیقات چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی لاہوری مرحوم۔

[2] از ظفر نامہ شاہجہان یعنی حصہ ششم تاریخ ہند مصنفہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم۔

وزن دار۔ پائدار۔ اور مستند اور صحیح معلوم ہوتی ہے ⁂

شالامار کے مختلف نام | اس شیطبر باغ کی تعمیری روایتوں کی طرح اس کے نام شالامار کی وجہ تسمیہ میں بھی کئی روایتیں مشہور ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس کا نام اصل میں شعلۂ ماہ یعنی چاند کا شعلہ تھا۔ بعض اس کو شالائے ماہ کہتے ہیں۔ شالا بزبانِ ہندی گھر کو کہتے ہیں۔ جیسے گو شالا۔ پاٹ شالا۔ دھرم شالا۔ ماہ فارسی لفظ ہے بمعنی چاند یعنی چاند کا گھر۔ بعضوں کے نزدیک "شالا مار" نام درست ہے۔ اور وہ کہتے ہیں۔ "شالا" گھر اور "مار" کشمیری میں ندی یا نالہ کو کہتے ہیں۔ یعنی ندی کا گھر۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ شالا مار ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنے باغ کے ہیں ⁂

رنجیت سنگھ کے دربار میں شالامار کی وجہ تسمیہ پر بحث | جج محمد لطیف اپنی تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں شالامار کی وجہ تسمیہ پر سرگرم بحث ہوئی۔ مہاراجہ نے کہا۔ ضلع جھنگ کی زبان میں شالا کے معنی پرمیشر کے ہیں اور "مار" دیسی زبان میں بددعا یعنی لعنت کو کہتے ہیں۔ میں ایسا نام پسند نہیں کرتا۔ مناسب ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے۔ ایک درباری نے کہا حضور شالامار ترکی لفظ ہے جس کے معنی عشرت گاہ کے ہیں۔ مہاراجہ نے کہا۔ اگرچہ چغتائی بادشاہوں نے ترکی نام رکھا ہے تو نادر شاہ کی تاریخوں میں اس کا نام شعلۂ ماہ کیوں رکھا گیا ہے؟ مہاراجہ نے خود ہی اس کا نام شالامار کی جگہ شہلا باغ تجویز کیا۔ اور کہا کہ شہلا کے معنے سیاہ چشم معشوق کے ہیں۔ اس لئے یہ نام بہت اچھا ہے۔ اور حکم دیا۔ کہ خط و کتابت سرکاری میں آئندہ اس کا نام شہلا باغ لکھا جائے ⁂

لہ رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم جو اپنے تاریخی مذاق کی وجہ سے علمی دنیا میں شہرت خاص رکھتے ہیں وہ جج محمد لطیف کے اس بیان کردہ واقعہ کے متعلق اپنے مضمون بعنوان "شالامار باغ لاہور" مندرجہ رسالہ ہمایوں لاہور جلد ۱ نمبر ۱ بابت ماہ جنوری ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں۔ یہ قصہ قدرے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ بحث اہل کاروں میں ہوئی ہوگی۔ مہاراجہ کو اس قدر باریکیوں سے کیا مطلب۔ ہاں یہ ممکن ہو سکتا ہے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۰)

باغ کا اصل نام کیا تھا

نج محمد لطیف نے اپنی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس باغ کا نام شالا مار نادر شاہ کے مورخوں نے لکھا ہے۔ میرے خیال میں نادر شاہی مورخوں کو شالامار کے معانی و مطالب معلوم نہیں ہو سکے ہونگے۔ اُنہوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ اس کا نام شعلہ ماہ ہوگا اور وہی بگڑ کر شالا مار بن گیا ہوگا۔ باغ کے مختلف طبقوں کے نام ضرور فرح بخش اور فیض بخش ہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ نہ صرف باغ لاہور کا نام باغ کشمیر کی طرح شالا مار باغ ہی تھا بلکہ باغ لاہور کے طبقوں کے نام بھی باغ کشمیر کے طبقوں کی طرح فرح بخش اور فیض بخش وغیرہ تھے۔ چنانچہ خلاصۃ التواریخ میں جو عالمگیر کے چالیسویں سال جلوس کی تصنیف ہے۔ شالا مار باغ لاہور کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ (صفحہ ۹۶ پر) درج ہے "اگرچہ در حواشی شہر فراواں باغ دلکشا و ہزاران گلشن فرحت افزا اما باغ شالامار کہ حضرت شاہجہان بادشاہ بتقلید باغ کشمیر احداث فرمودہ اند۔ دلفریب نظارگیاں است" یہ زمانہ یعنی عالمگیر کا چالیسواں سال جلوس نادر شاہی حملہ ۱۷۳۹ء سے قریباً ۴۱-۴۲ سال پیشتر کا تھا اور مصنف خلاصۃ التواریخ ان ایام میں بقید حیات تھا۔ نادر شاہی مورخوں نے شعلہ ماہ کا جو نام لکھا ہے وہ غلط ہے۔ چونکہ کشمیر کے شاہی باغ کا نام شالا مار باغ تھا۔ اس لئے اسکی تقلید میں لاہور کے باغ کا نام بھی شالا مار ہی مشہور ہو گیا۔ اور "شالامار" کے نام کی تصدیق اس قطعہ تاریخ سے بھی ہوتی ہے جو شاہجہان کے زمانہ ہی میں احداث باغ کے وقت ایک شاعر نے پیش کیا تھا۔ اور جس نے اس بحث کا قطعی خاتمہ کر دیا ہے کہ باغ کا اصل نام "شعلہ ماہ" ہے یا "شالا" سے "ماہ" یا "شالا مار"۔ وہ قطعہ جس سے سال ۱۰۴۷ھ برآمد ہوتا ہے

کہ لفظ شالا مار جس میں لفظ "مار" آتا تھا مہاراجہ کو پسند نہ آیا ہوگا۔ کسی درباری نے نام شہلا بنا دیا اور معنی بتلائے ہونگے جو مہاراجہ کو پسند آئے اور انہوں نے احکام جاری کر دیئے ؎

؎ منشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی میں نے یہ کتاب عرصہ ہوا پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں قلمی دیکھی تھی۔ اب ۱۹۱۸ء میں مراد آباد میں چھپ چکی ہے ؎

حسبِ ذیل ہے ؎

چوں شاہ جہاں پادشاہ جامئے دیں　　آراستہ "شالامار" باطرزِ متیں
تاریخ بنائے ایں زرضواں جُستم　　گفتا کہ بگو نمونۂ خلدِ بریں

البتہ آجکل اس باغ کا نام عام طور پر شالامار باغ کی جگہ شہلا باغ زیادہ وِردِ زبان زدِ عوام ہے۔ اور یہ غالباً اُس زمانہ سے ہے جب رنجیت سنگھ نے اس کا نام "شہلا باغ" سرکاری کاغذات میں رائج کرا دیا۔ اور یہ باغ ایک طور پر "شالامار باغ" کے طویل نام کا خلاصہ بھی ہے۔

اُستاد جانی میر عمارت شالامار | نواب علیمردان خان شاہجہان کا ایک اعلیٰ ملکی افسر ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ اعلیٰ انجینیر بھی تھا۔ اس کے ماتحت ایک نہایت اچھا معمار اُستاد جانی نام تھا۔ نواب علیمردان خان نے اس کی قابلیت اور ذہانت کا ذکر بادشاہ سے کیا۔ بلکہ ... ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نقشہ اس باغ کا بھی اسی نے مرتب کیا جو بادشاہ کو نہایت پسند آیا۔ اور اس صلہ میں اُستاد جانی کو شالامار کا میر عمارت مقرر فرمایا گیا۔

اُستاد جانی کا جب انتقال ہوا۔ تو بادشاہ اس وقت اجمیر میں تھے۔ نہایت افسوس کیا اور حکم دیا کہ خزانۂ لاہور سے اس کا مقبرہ سرکاری خرچ پر تعمیر کیا جائے۔ یہ مقبرہ موضع باغبانپورہ و گورستانِ مہر سنگا کے درمیان تھا۔ نواب شہنواز خاں ناظمِ پنجاب کے زمانہ تک جس کو آج (۱۹۲۳ء میں) قریباً پونے دو سو سال گذر چکے ہیں۔ مقبرہ اپنی اصلی حالت میں موجود تھا۔ لیکن حکومتِ مغلیہ کے زوال اور ناظمانِ لاہور کے خاتمہ کے بعد جب سکھوں کا عمل دخل پنجاب میں ہونے لگا۔ تو سنگِ مرمر کی خوشنما سلوں و مختلف قسم کے بیش قیمت پتھروں کی وجہ سے اس مقبرہ کی بھی شامت آگئی۔ اب رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ قبر کے تعویذ کا ایک بوسیدہ سا نشان موجود ہے۔ اور کسی خاص واقف کار کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں ہے کہ یہاں کس دل و دماغ کا ماہرِ تعمیرات دفن ہے۔

۱؎ تحقیقات چشتی ایڈیشن دوم صفحہ ۱۷۸۔ تاریخ لاہور رائے کنہیا لال صفحہ ۳۵۴

شالامار کا سب سے پہلا داروغہ شاہی | نواب علیمردان خان نے باغ کی تعمیر و آبادی کے لئے لاہور کے گرد و نواح میں زمین کی تلاش شروع کی۔ لاہور کے شرق رویہ بابوپورہ (باغبانپورہ) اسحاق پورہ دو مواضعات تھے۔ بادشاہ کے حکم سے اسحاق پورہ کی جگہ باغ تعمیر ہونا شروع ہوا۔ میر مہنگا اس زمین کا مالک تھا۔ بادشاہ نے قیمت دینی چاہی۔ مگر میر مہنگا نے باوجود بادشاہ کے اصرار کے قیمت لینے سے انکار کیا۔ چنانچہ اس شاہی باغ کی حفاظت و نگرانی نسلاً بعد نسلاً میر مہنگا کے سپرد ہوئی۔ اور میر مہنگا اس باغ کا سب سے پہلا شاہی داروغہ مقرر ہوا ۔

شاہ نہر اور آبپاشی کے چاہات | باغ کی چاردیواری کے باہر جنوبی گوشہ میں ایک عظیم الشان پختہ اور فراخ کنواں جس کو بارہ ہرٹا[1] چاہ کہتے ہیں کھدوایا گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چاہات تیار ہوئے۔ مگر اصل چیز جو اس وسیع و عالیشان اور بےنظیر باغ کی جان ہے۔ وہ نہر ماد ہو پور[2] ہے۔ جس کو دریائے راوی سے نکالنے اور شالامار باغ تک لانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی لاگت آئی تھی۔ چنانچہ منشی خوشحال چند[3] ساہی اپنی تاریخ محمد شاہی میں صفحہ ۱۳۸ پر اصلاحات شاہ نہر لاہور باہتمام علی مردان خاںؒ کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ "مبلغ یک لک روپیہ حوالہ علی مردان شد کہ از دریائے راوی نہرے کر آب بہ بساتینِ دار السلطنت خاطر خواہ رسد۔ جدا کردہ بیارد۔ چنانچہ از موضع راجپور کہ از انجا تا دار السلطنت مسافت چہل و ہشت و نیم کروہ جریبے بود شروع نمودہ بانجام رسانیدہ"۔ لیکن پانی بہت تھوڑی مقدار میں آتا تھا۔ اس لئے ملاء علاء الملک کو کہ فن

---

[1] سرکار انگریزی نے اس چاہ کو جو مرور ایام کی وجہ سے بالکل ویران ہو گیا تھا۔ از سر نو مرمت کرا کر اس میں ایک انجن لگایا ہے جو اس سے پانی کھینچ کر بالائی تالابوں میں لے جاتا ہے اور وہاں سے باغ کے فواروں کو سیراب کرتا ہے۔

[2] مادھو پور ضلع گورداسپور میں سجان پور سے چار پانچ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ میں نے یہ نہر سجان پور میں دیکھی ہے۔ پانی اس کا اس مقام پر نہایت شور تھا۔

[3] منشی خوشحالچند ساہی نے عالمگیر۔ بہادر شاہ۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کا زمانہ دیکھا ہے۔ تاریخ محمد شاہی میں علاوہ دیگر مفصل حالات کے محمد شاہ کی دس سالہ حکومت (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۴۱ھ) کا ذکر ہے۔ یہ تاریخ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اور میری نظر سے گذر چکی ہے ۔

آب ترازو میں صاحبِ کمال تھا۔ ایک لاکھ روپیہ اس غرض سے ملا کہ چشمۂ خیر ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے منبع نہر کو کشادہ تر کیا جائے۔ پادشاہنامہ میں لکھا ہے اور تاریخ محمد شاہی نے بھی صفحہ ۱۳۸ پر اس کی تائید کی ہے۔ کہ کارپردازوں نے بیوقوفی اور عدم مہارت سے اس روپیہ میں سے پچاس ہزار روپے نہر سابق کی مرمت میں صرف کر دیئے۔ آخر کار تیس کوس* نہر کھودی گئی۔ جس سے پانی بافراط آنے لگا۔ مصنف تاریخ محمد شاہی نے بھی لکھا ہے: "آب وافر را آورد۔ چنانچہ تا حال آب وافر بے فتور بہ باغات میرسد"
یہ نہر جس کا نام شاہ نہر ہے۔ اب تک جاری ہے اور صدہا مواضعات کو سیراب کر رہی ہے اس نہر کی اُس شاخ کا نام جو امرتسر سے لاہور اور پھر شالا باغ تک آتی ہے راجباہ شالا باغ ہے۔

شالا باغ کی لاگت و سالِ تعمیر | شاہ نہر کے دو لاکھ روپیہ کے علاوہ شالا باغ کی تعمیر پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ یعنی نہر اور باغ آٹھ لاکھ روپے میں تیار ہو گئے۔ آجکل جبکہ معمار کی یومیہ اُجرت اڑھائی تین روپے اور مزدور کی مزدوری ایک روپیہ سے سوا دو روپیہ تک روزانہ ہے۔ یہ لاگت شاید بہت کم معلوم ہو لیکن ذرا وہ زمانہ ذہن میں لائیے جب مزدور چار یا پانچ پیسے روزانہ اور معمار دو تین آنہ یومیہ کماتا تھا۔ اور غلہ گندم چار یا پانچ آنہ کو ایک من میسر ہو جاتا تھا۔ پھر آپ کو ۸ لاکھ کی قدر و قیمت معلوم ہو سکتی ہے۔

مدتِ تعمیر اور سالِ تعمیر کے متعلق تاریخ لاہور انگریزی ظفرنامہ شاہجہان، تاریخ لاہور اردو اور تحقیقاتِ چشتی میں لکھا ہے۔ کہ ایک سال چار ماہ پانچ یوم کی مدت میں یہ باغ تعمیر ہو گیا۔ لیکن تعجب ہے کہ باغ جس کی ابتدائی تعمیر ۱۰۴۷ھ سے شروع ہوتی ہے۔ اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سال چھ ماہ میں تیار ہو گیا۔ اس کی تیاری و تکمیل کی اطلاع ۱۰۵۰ھ میں بادشاہ کو ملتی ہے۔ چنانچہ ظفرنامہ شاہجہان میں شانزدہم سال جلوس کے واقعات ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء میں لکھا ہے: "بادشاہ سے عرض کیا گیا۔ کہ شالا مار باغ تیار ہو گیا ہے"۔ شاہجہان ۱۰۴۸ھ اور ۱۰۴۹ھ اور اپنے چودھویں

---

* بقول تاریخ محمد شاہی ۳۲ کوس۔

سال جلوس سنہ ۱۰۵۰ھ میں بھی لاہور میں آیا ہے لیکن ان سالوں میں کبھی اسے شالا باغ کی تکمیل کی اطلاع نہ دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سنہ ۱۰۵۰ھ کے بعد باغ کی کل عمارتیں اور نہر اور طبقے تیار ہوئے ہیں۔ اور جب سنہ ۱۰۵۲ھ میں شاہجہان لاہور آیا ہے۔ تو اسے ملاحظہ و معائنہ کے لئے عرض کیا گیا ہے۔ یا اگر یہ صحیح سمجھا جائے۔ کہ ایک سال چار ماہ پانچ یوم ہی میں باغ تیار ہوا ہے۔ تو پھر سنہ تعمیر ۱۰۴۷ھ نہیں بلکہ ۱۰۵۱ھ تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن شالامار کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ

ے

چوں شاہجہاں پادشاہ جائے دیں ــــ آراستہ شالامار با طرز متیں

تاریخ بنائے ایں زر ضواں جستم ــــ گفتا کہ بگو نمونۂ خلد بریں (۱۰۴۷)

اس تسلیم" کی تکذیب کرتا ہے۔ بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نمونۂ خلد بریں اُس کو اُس وقت کہا گیا ہے جب وہ باطرزِ متیں آراستہ ہو گیا تھا۔ یا بالفاظِ دیگر سنہ ۱۰۴۷ھ باغ کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ لیکن تمام مورخوں نے اس قطعۂ تاریخ کو چونکہ احداث باغ کا ابتدائی سال ظاہر کیا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ جب شاہجہان نے کشمیر کے نمونے پر لاہور میں بھی شالا باغ کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ تو شاعر نے اُسی وقت یہ برجستہ قطعہ موزون کر دیا ہو۔ لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے اس کو بہت پسند کیا۔ اور شاعر کو دس ہزار روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ عطا کیا ۔

نیز یہ قطعہ (نمونۂ خلد بریں ۱۰۴۷ھ) اس لئے بھی اختتام سال کی تاریخ نہیں ہو سکتا۔ کہ تاریخ محمد شاہی میں احداث نہر اور شالامار باغ کی آبپاشی کے ذریعہ کا ذکر سنہ ۱۰۴۹ھ کے واقعات میں کیا گیا ہے۔ گویا اُس وقت تک باغ نا مکمل تھا۔ اور شہنشاہ کے ملاحظہ کے قابل نہ تھا ۔

شاہجہان کا داخلہ شالا باغ میں

آخر وہ وقت آیا۔ کہ جب باغ کی چار دیواری مکمل ہو گئی۔ باغ کی آبپاشیاں، تالاب، فوارے، جھالرات اور مختلف طبقے اور ان طبقوں کی عمارتیں اور شاہ نہر تیار ہو گئی۔ بلکہ چار پانچ سال کے عرصہ میں باغ کے گل و شجر بھی اپنی بہار دکھانے لگے تو نواب علی مردان خان نے شہنشاہ کی خدمت میں باغ کی

تیاری و تکمیل کی گذارش کی اور اس کے ملاحظہ و معائنہ کے لئے عرض کیا۔ شہنشاہ نے شاہی منجموں کو ساعتِ سعید دیکھنے کا حکم دیا۔ ان سب نے متفق ہو کر ایک تاریخ مقرر کی۔ اور شہنشاہ معہ اعیانِ سلطنت ۷ر شعبان المعظم ۱۰۵۲ھ کو اس باغ میں جس کو شاعر نے بجا طور پر نمونہ خلد بریں کہا ہے داخل ہوا ۔

شاہجہان باغ اور اُس کی پُر تکلف عمارات۔ حمام۔ آبشار۔ بڑے تالاب اور تختِ سنگِ مرمر اور باغ کے مختلف طبقوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ وزراء اور امرائے دربار نے مبارکباد دی۔ اور سب نے مل کر شہنشاہ کے قیام سلطنت اور اس کی درازئ عمر اور جاہ و جلال کی دعا کی۔ بادشاہ کے حضور میں اس وقت ہندوستان اور ممالکِ غیر کے منتخب حکیم و دانا علماء و فضلاء و سیاحانِ عالم اور برگزیدہ اہل دماغ تھے۔ جو روم۔ عراق اور ماوراء النہر تک کی بہاریں دیکھ آئے تھے۔ سب نے عرض کیا۔ ایسا باغ کہیں تعمیر ہوا ہے نہ کہیں دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ اسی باغ میں ۱۳ر شعبان کو شہنشاہ نے سعید خان کو خلعتِ خاصہ اور صوبیداری لاہور کا اعزاز بخشا۔ ۲ر رمضان کو بادشاہ اکبر آباد روانہ ہو گیا ۔

باغ کے متعلقہ مکانات

ملا عبد الحمید لاہوری جو شاہجہان کے زمانہ کا ایک نامور مصنف گذرا ہے بادشاہنامہ میں لکھتا ہے۔ اس باغ کے ساتھ اس قدر مکانات تیار کئے گئے تھے کہ جب کبھی شہنشاہ لاہور آتا تھا۔ اور اس کے حرم محترم اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ تو شہنشاہ کو بیگمات کے لئے خیمہ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ امراء۔ وزراء مہتابی باغ اور گلابی باغ وغیرہ کے مکانات میں کہ وہ بھی عالیشان اور خوشنما تھے ٹھہرا کرتے تھے ۔

شالامار کے سات تختے

شالامار درحقیقت سات باغوں کا ایک باغ تھا جن کے نام بھی مختلف تھے۔ اب وہ باغ جس کا نام شالامار ہے تین تختوں پر منقسم ہے۔ ہر تختہ کا نام الگ الگ ہے۔ اب عام لوگ انہی تینوں تختوں یا طبقوں کو شالامار سمجھتے اور کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ساتھ چار باغ بھی تھے۔ جن میں سے تین تو اس وقت کسی نہ کسی حالت میں

موجود ہیں۔ ایک کا پتہ نہیں چلتا ÷

انگوری باغ | شالامار کے ہر باغ کا حال الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ باغ شالامار کے جنوب کی طرف واقعہ ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مالِ مفت دلِ بے رحم کی مشہور ضرب المثل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ بادشاہی باغ پنڈت برج ناتھ ایک برہمن کو سنکلپ کر دیا تھا۔ جو آج تک اُس کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ اس باغ میں صرف انگور کی بیلیں تھیں اور اپنی سرسبزی و شادابی سے دلوں کو ناقابل بیان فرحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی طراوت دیتی تھیں ÷

عنایت باغ | اس کو باغِ عنایت آباد بھی کہتے ہیں۔ یہ انگوری باغ اور شالامار کے درمیان واقع ہے۔ یہ باغ جس کی چار دیواری شاہجہانی عہد کی اب تک موجود ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں سردار بخشیش سنگھ سندھانوالیہ کو عنایت ہوا تھا۔ اب بھی سردارانِ سندھانوالیہ اس پر قابض ہیں۔ شالامار کے بڑے دروازے کے سامنے یہ باغ موجود ہے۔ نہر جو شالامار کو سیراب کرتی ہے اسی باغ سے ہو کر آتی ہے۔ شالامار کے بڑے دروازہ اور عنایت باغ کے درمیان صرف امرت سر کی جرنیلی سڑک ہے۔ اس باغ میں جو عمارات لبِ سڑک واقعہ ہیں جہاں دو دوکاندار بھی بیٹھتے ہیں اور جن سے چندقدم آگے پولیس کی چوکی اور خچرخانہ اور ایک کنواں ہے۔ ان پر سرکار انگریزی کا قبضہ ہے۔ باغ میں آموں کے درخت بکثرت ہیں۔ زراعت بھی اس میں کافی ہوتی ہے۔ نہر کے دونوں طرف باغ کے اندر ایک مقام پر پختہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ اب وہ مسمار ہو چکے ہیں۔ اور ان کے نشانات موجود ہیں۔ یہ مکان غالباً سکھوں کے زمانے میں بنائے گئے تھے۔ جب یہ باغ اپنے پورے شباب پر تھا۔ تو یہ شعر اس کے بالکل حسبِ حال تھا ؎

چہ گویم وصفِ گلزارِ عنایت | کہ از وصفش نہ حد است و نہ غایت

مہتابی باغ | یہ باغ موجودہ شالامار کے تیسرے تختہ فرح بخش سے ذرا آگے شمال کی طرف تھا۔ اور شالامار کا چھوٹا باغ کہلاتا تھا۔ اب بالکل ویران پڑا ہے۔ دیواریں بھی

نظر نہیں آتیں۔ البتہ سرکار انگریزی کے ابتدائی عہد تک خستہ و شکستہ حالت میں موجود تھیں۔ سرکار نے سنہ ۱۸۶۹ء میں وہ دیواریں رائے میلا رام[1] ٹھیکہ دار کے پاس فروخت کردیں۔ اور اُس نے ایسی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ کہ وہاں کوئی اینٹ تک بھی نہ رہنے دی +

دوسرے تختے میں جس کا نام حیات بخش ہے دو کلان دروازے ہیں جن میں سے ہاتھی معہ ہودہ بفراغت تمام گذر سکتا ہے۔ ان دروازوں پر کانسی کا پُرتکلف کام ہے۔ ان میں سے شرقی بند ہے اور غربی کھلا ہوا ہے۔ اس باغ یعنی حیات بخش کے شمال کیطرف میانہ میں ایک بارہ دری ہے جس کی شرقی و غربی بغل میں ایک ایک در تھا۔ انہی دروں میں سے مہتابی باغ شالامار کے ساتھ ملحق تھا۔ یہ دروازہ جو شاہی زمانہ کا تھا۔ اب بالکل بند ہے +

رنجیت سنگھ نے بھی اپنے عہد میں شالامار سے مہتابی باغ کو جانے کے لئے دو رستے نکلوائے تھے۔ ایک مشرق کی طرف دوسرا مغرب کی جانب چھوٹا سا دروازہ جو اب بھی بارہ ہرٹا چاہ کی طرف موجود ہے +

جہاں مہتابی باغ تھا وہاں آم کے درخت منتشر طور پر اب بھی موجود ہیں باغ کی ویران زمین پر اب زراعت ہوتی ہے +

گلابی باغ یہ باغ جو درحقیقت شالامار کا ساتواں یا آخری باغ کہلاتا ہے۔ شالامار سے مغرب کی طرف واقعہ تھا۔ اس باغ میں صرف پھل پھول اور گل و گلزار ہر موسم میں بوئے جاتے تھے واقعی اسم بامسمیٰ باغ تھا۔ افسوس اب اس کا کہیں نام بھی نہیں ہے +

شالامار باغ شالامار کے چار باغات کا جو ہر چند طبقوں اور تختوں کی شکل میں تھے بیان ہو چکا ہے۔ اب صرف اُن تین باغوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن کا نام شالامار باغ مشہور ہے اور جو تین تختوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سے پہلے تختہ

[1] لاہور کے مشہور رئیس آنریبل رائے بہادر لالہ رام سرن داس سی۔ آئی۔ ای آپ ہی کے صاحبزادہ تھے۔

کا نام فیض بخش ہے ٭

نگار خانہ یا نگاہ خانہ شالامار کے مشرق کی طرف ایک مقام نگاہ خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ جس کو عام لوگ نگار خانہ کہتے ہیں۔ اس کے شمال و جنوب میں دو بڑے دروازے ہیں۔ اور گرد و نواح میں چار دیواری خشتی ہے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ غربی بارہ دری میں بیٹھ کر فوج کا ملاحظہ کرتا تھا۔ فوج ایک دروازہ سے آتی اور دوسرے سے نکل جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اس مقام کا نام نگاہ خانہ رکھا گیا۔ مگر غلط العام نگار خانہ مشہور ہو گیا۔ وہ بارہ دری جس میں بادشاہ جلوس فرما ہوتا تھا سکھوں کے آخر عہد میں مسمار ہو گئی تھی۔ سر ہنری کرنل لارنس نے اپنے زمانہ ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۰ء میں اس کی تعمیر کرا دی تھی ٭

خوابگاہ یا باغ کا بڑا دروازہ تحقیقاتِ چشتی[1] کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ باغ کا اصل دروازہ جو شاہی زمانہ میں تھا۔ اصطبل کی شمالی و غربی جانب تھا وہ دروازہ اب گرا دیا گیا ہے۔ موجودہ دروازہ جس کے اندر سے باغ میں داخل ہوتے ہیں اور چارمرہ جانے والی سڑک کے کنارہ پر واقع ہے۔ بعد میں بنایا گیا ہے۔ یہاں ایک خوابگاہ تھی اور اسی خوابگاہ کی دیوار کو پھاڑ کر موجودہ کلاں دروازہ آمد و رفت کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ لکھا ہے۔ کہ یہ خوابگاہ تمام و کمال سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی۔ یہ خوابگاہ باغ کے پہلے درجہ پر تھی ٭

تاریخ لاہور انگریزی مصنفہ خان بہادر جج محمد لطیف میں لکھا ہے۔ اس کے اندر سنگ مرمر کی ایک عمارت تھی۔ سکھ حاکمان لاہور نے اس کا پتھر اور فواروں کا تانبا جو کئی من وزنی تھا کمینوں کے پاس فروخت کر دیا۔ اور عمارت کو بالکل برباد کر دیا ٭

دروازہ کلاں کے اندر داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی کے اندر عین وسط میں ایک فوارہ ہے اور اس کے سامنے ہی فواروں کی لمبی قطار بڑی بارہ دری تک چلی جاتی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل دروازہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اصل دروازہ باغ کی شان اور حیثیت کے مطابق بہت کھلا ہونا چاہئے تھا۔ اور اس میں داخل ہوتے اور باہر نکلتے

[1] لہ ایڈیشن دوم صفحہ ۱۳۲

سے اُترتے ہی فواروں کی ضرورت نہ تھی ✦

خواص پورہ	خواب گاہ کے متصل خواص پورہ کے نام سے ایک بہت بڑی عمارت تھی ۔

جہاں شاہی بیگمات تفریح کے لئے جاتی تھیں ۔ سکھوں کے زمانہ میں اسکی بنیادیں تک بھی کھود دی گئیں ۔ اور بعد انگریزی کرنل نسبٹ ڈپٹی کمشنر کے زمانہ میں اس کا ملبہ بھی فروخت کر دیا گیا ۔ یہی کرنل نسبٹ بعد میں کمشنر راولپنڈی اور پھر ریذیڈنٹ کشمیر ہوگئے تھے ✦

پہلا تختہ یا باغ فیض بخش	شالا باغ کے اس تختہ کی ڈیوڑھی ہی باغ کا دروازہ کلاں ہے

ڈیوڑھی کی پیشانی بالکل سادہ ہے ۔ چند سیڑھیوں کے بعد عین وسط صحن میں ایک فوارہ ہے جو ٹوٹا ہوا ہے ۔ ڈیوڑھی میں اور مسقف برانڈہ کی دیواروں پر سنگ مرمر کا بکثرت استعمال ہے ۔ اس باغ کی جنوبی جانب میجر میکاٹ گریگر ڈپٹی کمشنر لاہور نے بارہ دری کے اندر سے ایک جدید دروازہ اپنے عہد میں نکالا تھا ۔ جو اب تک قائم و جاری ہے ۔ ڈیوڑھی کے مسقف برانڈہ کے پاس ہی سے فوارے شروع ہو جاتے ہیں ۔ جن کے دونوں طرف ۱۲ ۔ ۱۲ فٹ چوڑا پختہ فرش ہے ۔ بیس فواروں کے بعد ایک وسیع حوض آتا ہے ۔ جس کے چاروں طرف فوارے اور نہریں رواں ہیں ۔ اور ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے سنگِ سُرخ کا فرش آتا ہے ۔ حوض میں بھی ۱۵۲ ہی فوارے ہیں ۔ شرقی اور غربی جانب بیس بیس فواروں کے بعد ایک بارہ دری آتی ہے ۔ اور ڈیوڑھی کے بالمقابل وہ بارہ دری کلاں ہے ۔ جس کے نیچے دوسرا تختہ یعنی باغ حیات بخش واقعہ ہے ۔ باغ فیض بخش کے چاروں گوشوں پر بُرجیاں ہیں ۔ جن کے آٹھ آٹھ محرابی در ہیں ✦

راقم الحروف نے ۱۸۹۷ء اور ۱۸۵۸ء کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب درختوں کی گنجانی کی وجہ سے میلہ کے ایام میں تماشائیوں کو خیمے لگانے دشوار ہو جاتے تھے اب یہ حال ہے ۔ کہ دور دور تک سبزہ کا قدرتی فرش مخمل کے بچھونے کا لطف دے رہا ہے ۔ درخت اب بھی اس تختہ پر بکثرت ہیں ۔ مگر پھر بھی ان میں سے بہت سے

چھانٹ دیئے گئے ہیں ٭

شاہی حمام | شالامار کے تختہ اوّل کی بارہ دری کلاں کے متصل شرقی گوشہ میں مینار دبرجی) کے نیچے ایک کمرہ تین دروازوں والا آتا ہے۔ جس کی کنجی سرکاری ملازموں کے پاس رہتی ہے۔ یہ رستہ شاہی حمام کو جاتا ہے۔ اس کمرہ کے آگے چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اور کئی مختلف قسم کے چھوٹے بڑے سات آٹھ کمرے آتے ہیں۔ جن کے دروازوں پر کشمیری صنعت کے نقش ونگار اور گل بوٹے اب تک اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ اندرونی دیواریں منقش ہیں۔ ایک جگہ ایک کنواں بھی ہے جو اب بند کر دیا گیا ہے۔ اس حمام کے تین درجے ہیں۔ پہلے اور دوسرے درجہ میں دو فوارے۔ تیسرے درجہ میں ایک حوض بغسل خانہ۔ جن کی شرقی و غربی جانب دو دو آب ریز۔ ایک طرف ٹھنڈے پانی کا ذخیرہ یعنی سرد حوض اور دوسری طرف آب گرم کا حوض۔ مقام آتش دان باغ کے باہر مشرق کی طرف ہے۔ اس حمام کو ایک راستہ دُوسرے تختہ یعنی باغ حیات بخش سے بھی جاتا ہے۔ جو پہلے تختہ سے تیرہ چودہ فٹ نشیب میں ہے۔ مگر اس راستہ کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے ٭

اس تختہ میں دو کنوئیں بھی ہیں۔ ایک تو ڈیوڑھی کلاں کے پاس ہی ہے جو چھوٹا ہے۔ اور چاہ کلاں بارہ دری کلاں کے رستے میں آتا ہے ٭

میلہ کے دنوں میں یہاں خلقت کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے اور دوکانیں اس کثرت سے لگتی ہیں کہ تِل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی ٭

سنگ یشب کا بیش قیمت حوض | محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ تک اس باغ کی حفاظت و خبر گیری ناظمان لاہور کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ مگر سلطنت کو ضعف آنے پر جب مسلمان اپنی حفاظت کرنے کے بھی ناقابل ہو گئے۔ اور پنجاب میں لٹیروں نے غلبہ پانا شروع کر دیا۔ تو لاہور اور اس کے مفصلات کے لاکھوں انسانوں کی قسمتیں ان تین نا اہلوں[٭] نے آپس میں بانٹ لیں۔ جو اخلاق و عمل۔ تمدن و تہذیب بلکہ

٭ لہنا سنگھ۔ سوبھا سنگھ۔ گوجر سنگھ تینوں حاکموں کو سہ حاکمان لاہور۔ اور راگ الگ کو احد احاکم کہتے تھے ٭

علم و عقل سے بھی کورے تھے۔ جو انسان کے ساتھ انسان کے لحاظ سے نہیں بلکہ مذہب کے اعتبار سے سلوک کرتے تھے۔ اور بعض اوقات وہ لوٹ گھسوٹ اور مار دھاڑ اور متمول لوگوں سے زبردستی روپیہ حاصل کرنے کے طمع میں مذہب کی پاسداری کو بھی خیر باد کہہ دیتے تھے۔ ان میں سے ایک حاکم کا نام لہنا سنگھ تھا۔ جو دہلی دروازے اور شہر کے تمام مشرقی حصے کا جس میں درس میاں وڈا اور شالا مار بھی شامل تھے مالک و حاکم تھا۔ جب سکھوں نے شالا مار باغ پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ تو حافظ علیم اللہ داروغہ نے جو مہر مہنگا شالا مار کے سب سے اول شاہی داروغہ کی اولاد سے تھا۔ سنگِ یشب کے ایک حوض پر جس کی قیمت کا اندازہ لاکھ روپیہ کے قریب بیان کیا جاتا ہے اس خوف سے بیلوں کی ایک آخُر (کھُرلی) بنالی کہ کہیں یہ ناخدا ترس اس کو بھی تباہ نہ کردیں۔ سعید نام ایک شقی القلب مہر مہنگا سے عداوت رکھتا تھا۔ اس نے لہنا سنگھ اور الحاکم کے پاس اس قیمتی حوض کی مخبری کردی۔ لہنا سنگھ نے خبر ملتے ہی اس حوض کا سراغ نکالا اور اس کو کھدوا کر حکاکوں کے پاس پچیس ہزار روپیہ میں فروخت کردیا۔

بارہ دری کلاں یہ بارہ دری جو آبشار کلاں کے سر پر سایہ کیے ہوئے فیض بخش کی زینت کو دوبالا کر رہی ہے۔ اس کو محل میانہ بھی کہتے ہیں۔ اس بارہ دری کی کتنی عظمت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سنگِ مرمر کی سلوں کا فرش۔ سنگِ مرمر کی جالیاں جو منڈیروں پر لگی ہوئی تھیں۔ چھت کے نقش و نگار۔ تالاب۔ حوض۔ آبشار اور فواروں کے نظارے ناظر کا دل کھینچنے کے لیے کافی سے زیادہ اثر رکھتے تھے۔ سِکھ حاکمانِ لاہور کا دور ختم ہونے کے بعد رنجیت سنگھ نے جو سلوک اس بےنظیر باغ کے پہلے تختہ کے ساتھ کیا۔ اس کی تھوڑی سی کیفیت ذیل کی سطور سے معلوم ہوسکیگی[۱]:۔ رنجیت سنگھ نے بارہ دری کلاں سے جو بالائے آبشار ہے سنگِ مرمر

[۱] تاریخ لاہور رائے بہادر کنہیا لعل ایگزیکٹو انجینیر لاہور ڈویژن صفحہ ۳۵۵ مطبوعہ سنہ ۱۸۸۴ء

کی سلیں اور پتھر معہ جالیوں کے اُتروا کر دربار امرت سر بھجوا دیا۔ بعد میں سفیدی سے درستی کرادی گئی

اب بھی بارہ دری میں ہر اتوار کو بڑی رونق رہتی ہے۔ لوگ اپنے دوست و احباب کو جو پارٹیاں اور دعوتیں دیتے ہیں۔ وہ اسی بارہ دری میں ہوتی ہیں

ہمارے مٹنے میں بھی ہے نمود کی اک شان مؤلف
مٹے بھی ہم تو مٹے ہیں گیاہ کی صورت

بارہ دری کی چار دیواری چار چار فٹ تک سنگِ مرمر سے مزین ہے۔ چھت نہایت نفیس خوبصورت اور خوشنما ہے۔ خوشنما بیل بوٹے۔ کئی طرح کے نقش و نگار خوبصورت شیشوں کی دلآویزی۔ یہ سب باتیں نہ صرف پرانے صناعوں کی یاد دلا رہی ہیں۔ بلکہ اس اُجڑی ہوئی حالت میں بھی باغ کی رونق اور سیاح کی تفریح طبع کا باعث ہیں۔ یہی وہ دلکش مقام ہے۔ جہاں بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ وزراء۔ اُمراء اور رؤسا سے لے کر غریب غرباء تک دوسرے تختہ کی تمام کیفیت ملاحظہ کرتے چلے آئے ہیں۔

سرد خانہ | گذشتہ زمانہ میں بجلی کے پنکھے نہیں تھے اور نہ برف کے کارخانے اس کثرت سے جاری تھے۔ اس لئے گرمی میں سردی کا لطف اُٹھانے کے لئے بادشاہوں کے محلات اور امراء کے مکانات کے نیچے سرد خانے یا بھورے بنائے جاتے تھے۔ اس قسم کے بھورے آج بھی بڑے بڑے شہروں خصوصاً لاہور کے ہر پرانے مکان کے نیچے موجود ہیں۔ اُمراء گرمی کے دنوں میں ان سرد خانوں میں جا کر لطف اُٹھاتے تھے۔ اسی قسم کا سرد خانہ بارہ دری کلاں کے جنوب میں دس بارہ قدم کے فاصلہ پر واقع ہے جس کی ایک دیوار بہت بڑے کنوئیں سے ملحق ہے۔ بائیس سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک محرابی چھت کے نیچے نشست گاہ بنی ہوئی ہے۔ جہاں سے پانی دو اڑھائی گز کے فاصلہ پر ہے۔ بادشاہوں نے تو جو لطف اُٹھانا تھا اُٹھا چکے اب تو یہاں عام لوگ بھی نہیں آتے نہ موجودہ زمانہ کے ساز و سامان نے اب ان کی

ضرورت ہی رہنے دی ہے۔ البتہ سیاح لوگ آتے ہیں۔ اور سردخانہ کی سیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں ۔

شاہجہان کا جشن نوروز شالا باغ میں

شاہجہان جب کبھی شالامار کی تعمیر و تکمیل کے بعد لاہور آیا ہے۔ تو اس نے باغ ہی میں جو اس نے بڑے شوق سے بنوایا تھا اقامت کی ہے۔ غرہ ربیع الثانی ۱۰۶۱ھ کو جب وہ سفر کشمیر کے لئے لاہور پہنچا تو اسی باغ میں اترا۔ اور تختہ فیض بخش میں اس نے جشن نوروز کیا۔ جس میں ایک عظیم الشان دربار ہوا۔ نذریں پیش ہوئیں اور خلعت و منصب اور انعام و اکرام سے مستحقین سرافراز کئے گئے۔ ۲۵ رجادی الثانی ۱۰۶۱ھ کو بادشاہ یہاں سے کشمیر روانہ ہوا۔

دوسرا تختہ یعنی باغ حیات بخش

شالامار کا یہ تختہ خوبصورتی۔ خوشنمائی۔ رونق و زینت اور نظاروں کی دلآویزی میں تمام درجوں سے بہتر و افضل بلکہ تمام باغ کی جان ہے۔ اس تختہ کو بارہ دری کلاں کی دونوں جانب سے رستے ہیں۔ چند سیڑھیوں کے بعد جن میں پانچ پانچ چھ چھ آدمی ایک ساتھ اتر سکتے ہیں۔ اور جن میں میلے کے ایام میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اس تختہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس باغ کے شرقی و غربی حصص نشیب میں ہیں۔ غربی حصہ کی دیوار کے عقب میں مہتابی باغ اپنی اجڑی ہوئی حالت میں نظر آرہا ہے۔ شرقی دیوار کے ایک پہلو میں شاہی حمام کو رستہ جاتا ہے جس کا ذکر طبقہ اول میں کیا جا چکا ہے ۔

آبشار کلاں اور سنگ مرمر کا تخت

اس بارہ دری کے نیچے آبشار جاری ہے۔ جس کی خوشنمائی کی تمام سیاح اور صناع بے حد تعریف کرتے ہیں۔ آبشار کی چادر پر سے پانی لہریں بن کے آتا ہے اور تخت کے نیچے سے ہو کر بڑے تالاب میں چلا جاتا ہے۔ آبشار اور تخت کے درمیان ایک فوارہ ہے جو گرمیوں میں عجیب لطف دیتا ہے۔ آبشار اور تخت دونوں سنگ مرمر کے ہیں۔ تخت کے گرد ایک کٹہرا ہے وہ بھی سنگ مرمر ہی کا ہے۔ شاہجہان بہ نفس نفیس یہاں بیٹھنا اور گرد و پیش کے نظاروں۔ فواروں۔ حوضوں۔ تالابوں اور آبشار سے پانی کے گرنے کی

کیفیت دیکھ کر باغ باغ ہوتا تھا۔ اور اپنا یہ طبعزاد شعر پڑھتا تھا ؎

شکر صد شکر مثلِ فوارہ — وقفِ عام است ایں خزانۂ ما

سنگِ مرمر کا یہ بادشاہی تخت سیاح کو ٹوٹا ہوا نظر آئے گا۔ تخت کے اس ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ رنجیت سنگھ نے جب لاہور اور مضافات لاہور[۱] کے روساء اور ذمہ دار لوگوں کو اطمینان دلایا۔ کہ اگر تم میرے قبضۂ لاہور میں مزاحم نہ ہو۔ تو میں تم کو نہ صرف سکھ حاکمانِ لاہور کے ظلم و ستم سے نجات دلاؤں گا بلکہ تمہارے مذہبی مکانات اور شاہی عمارات کو بھی گزند نہ پہنچاؤں گا۔ تو انہوں نے رنجیت سنگھ کو ہر قسم کی مدد دی۔ بلکہ دروازے تک کھول دیئے۔ رنجیت سنگھ نے قابض ہو کر اور اپنے پاؤں مضبوط جما کر وعدے کو بالائے طاق رکھا۔ اور اسلامی عمارتوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ آج لاہور کے کسی اسلامی مقبرہ اور کسی اسلامی عمارت پر سنگ مرمر، سنگِ یشب، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ نظر نہیں آتا۔ اگر سکھوں کی حکومت دس بیس سال اور رہ جاتی۔ تو شاید اسلامی عبادت گاہوں اور اسلامی مقبروں کا وجود بھی نہ رہتا۔ اور اگر رہتا۔ تو وہاں یا اصطبل ہوتے یا گولہ بارود یا سکھ حکام کی رہائش نہ مسجد مسجد رہتی نہ مقبرہ مقبرہ۔ غنیمت ہے۔ کہ بہت جلد الحاق پنجاب نے نہ صرف مسلمانوں کے زخمی دلوں کی بلکہ ان کی آفت رسیدہ عمارتوں کی بھی کچھ مرہم پٹی کر دی ؎

یہ کس نے پاؤں رکھا سرِ گورِ غریباں پر — زمیں سے پھر ابھر آیا مزار بے نشاں میرا

تختِ سنگِ مرمر سے رنجیت سنگھ کا سلوک

غرض رنجیت سنگھ نے اور اسلامی عمارتوں کو تباہ کرنے کے ساتھ شالامار پر بھی توجہ شروع کی۔ سکھ حاکمانِ لاہور بہت کچھ یہاں سے لے گئے تھے۔ پھر بھی تختِ شاہی اور بارہ دریوں کے فرشِ سنگِ مرمر کے ابھی باقی تھے۔ رنجیت سنگھ نے حکم دیا۔ کہ تخت یہاں سے اکھاڑ کر دربار صاحب امرتسر میں پہنچا دیا جائے۔ تاکہ گرنتھ صاحب اس پر رکھا جایا کرے۔ مصنوعی

[۱] نواں کوٹ۔ باغبانپورہ وغیرہ ؎

نے تخت کو اکھاڑنا شروع کیا۔ مگر باوجود رنجیت سنگھ کی تاکید اور صناعوں کی بڑی احتیاط کے وہ تخت ٹوٹ گیا۔ اور کاریگروں نے کہہ دیا۔ کہ اس کا ثابت اُکھڑنا اور پھر قائم ہونا قریباً ناممکن ہے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی جگہ جس کو بعد میں لوہے کے شکنجہ سے جکڑا گیا ہے اب تک موجود ہے۔

زیب النساء کی مشہور رباعی

زیب النساء بیگم سنگِ مرمر کے اس تخت پر بیٹھ کر آبشار کی روانی و دوانی اور ترنم و نغمہ ریزی کے لطف اُٹھایا کرتی تھی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے شاہی بیگمات اور حور وش کنیزوں کی مجلسوں میں وہ اپنے سحر طراز کلام سے دلوں کو مسخر کرتی تھی۔ اور ارد گرد کے خوبصورت نظارے اس کے تخیل کی وسعت اور اس کے شاعرانہ جذبات کی جولانگاہ تھے شہنشاہ کا اس باغ کی تعمیر سے یہ مقصد بھی تھا۔ کہ شاہی حرموں کے لیئے بھی کوئی تفرج گاہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ شاہی حرم کھلے اور آزادانہ طور پر باغ کے ہر طبقہ میں چل پھر سکتے تھے۔

زیب النساء ایک مرتبہ پانی کی چادر (آبشار) کے دلکش نظارہ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کہ یکایک اس کے جذبات موجزن ہوئے اور اس نے آبشار کو مخاطب کر کے کہا ؎

اے آبشار نوحہ گر از بہرِ چیستی
چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی
آیا چہ درد بود کہ چوں ما تمام شب
سر را بہ سنگ میزدی و میگریستی

یہ رباعی کس قدر درد انگیز اثر اپنے چار مصرعوں کے اندر رکھتی ہے۔ اور قابل شہزادی کے خیالات کی بلند پروازی پتھر کی سل پر سے پانی کی روانی کے نظارہ کو کہاں سے کہاں تک لے گئی ہے۔ اس کو اہل دل اور سخن فہم بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

حوضِ کلاں اور اس کے فوارے اور بارہ دریاں

اس تخت سے آگے وہ حوضِ کلاں ہے جو بہت بڑے تالاب کا کام دیتا ہے اور جس میں میلہ کے دنوں میں لوگ نہاتے اور کودتے اور تیرتے اور فواروں کو کبھی کھولتے اور کبھی بند کرتے ہیں۔ تالاب کے عین وسط میں ایک چبوترہ ہے جس کی شرقی و غربی جانب تو ایک ایک بارہ دری ہے۔

اور شمال کیطرف ساون بھادوں اور جنوب کی طرف تخت اور بارہ دری کلاں ہے۔ تالاب سے بارہ دریوں کے نیچے سے پانی گذرتا ہے۔ اور ان آبشاروں پر لہریں مارتا ہوا جو ان بارہ دریوں کے نیچے بنی ہوئی ہیں۔ باغ کی تمام نہروں میں پھر جاتا ہے ٭

حوض میں جس کو عموماً تالاب کہتے ہیں۔ بیشمار فوارے ہیں۔ تاریخ لاہور (انگریزی) کے مصنف نے شالامار کے تینوں طبقوں کے فواروں کی تعداد ساڑھے چار سو لکھی ہے جس شخص نے کشمیر کی سیر کی ہے۔ اور وہاں ڈل کی دلفریب کیفیت کو دیکھا ہے۔ اس کو اس تالاب کے کناروں پر ڈال کے گھاس کی تھوڑی سی جھلک نظر آئیگی جو پانی کے نیچے اپنی سبزہ زار کیفیت خاموشی کے ساتھ بیان کر رہا ہے ٭

آبشار کلاں کا پانی اسی تالاب میں آ کے جمع ہوتا ہے۔ جب گرمیوں میں فوارے جمع ہوتے ہیں اور تمام تالاب میں پانی اچھلتا نظر آتا ہے۔ تو دلوں میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور باغ واقعی نمونہ خلد بریں ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ باغ ایک معمولی باغ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مغلیہ جاہ و جلال اور ہندوستان میں اسلامی عظمت و شوکت کی ایک عالیشان یادگار دکھائی دیتا ہے ٭

ساون بھادوں کا نظارہ | تالاب کی شمالی دیوار کے عین درمیان ساون بھادوں کا مکان سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ جس کے مشرق و مغرب میں وہ خوبصورت بارہ دریاں ہیں۔ جن کا سنگِ مرمر فرش سے اکھاڑ کر اور دیواروں سے اتار کر رام باغ امرتسر پہنچا دیا گیا۔ لیکن وہ لوگ جو دولت۔ امارت اور حکومت و قوت کے رعب میں اپنے آپ کو قانونی گرفت بلکہ قہر الٰہی کے عذاب سے بھی آزاد سمجھتے تھے بہت جلد اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے ٭

مسلمانوں کی اس زمانہ میں حالت یہ تھی کہ کسی جگہ بلند آواز سے اذان بھی نہ دے سکتے تھے۔ اپنی مقدس عمارتوں اور اپنے بادشاہوں کے عالیشان مکانات کو تباہ و برباد ہوتے دیکھتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔

مریض ہیں کہ مرض کی خبر نہیں رکھتے جگر میں درد ہے لیکن جگر نہیں رکھتے

ہر بارہ دری میں آٹھ در ہیں۔ چھت کشمیر کے نمونہ کا ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔ ساون بھادوں کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے اندر پانچ فوارے ہیں۔ وسط کا فوارہ باقی سب فواروں سے بڑا ہے۔ جنوبی۔ شرقی اور غربی دیوار میں چھوٹے چھوٹے محرابدار سنگ مرمر کے طاقچے چراغ رکھنے کے لئے بنے ہوئے ہیں۔ ان طاقچوں میں رات کے وقت جب چراغ جلا کر رکھے جاتے ہیں اور پانی تالاب سے ہو کر طاقچوں میں آتا اور وہاں سے فواروں کے حوض میں گرتا ہے تو چراغوں کی شعاعیں وہ کیفیت پیش کرتی ہیں جو بارش کے دوران میں بجلی کی چکا چوند سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے تختہ میں بھی آم اور دوسری اقسام کے بہت سے درخت ہیں۔ مگر یہ تختہ اب درختوں سے بالکل صاف کر دیا گیا ہے۔

تیسرا تختہ یعنی باغ فرح بخش یہ تختہ جس کو پائین باغ بھی کہتے ہیں۔ باغ حیات بخش کے نشیب میں ہے۔ اوپر کے دونوں باغوں کا پانی ساون بھادوں کے ذریعے اس باغ میں سے ہو کر آگے نکل جاتا ہے۔ ساون بھادوں کے نشیب سے ایک مستطیل حوض کے بعد جس میں سات فوارے ہیں پہلے تختہ کی طرح فواروں کی ایک قطار شروع ہوتی ہے جس میں ۳۲ فوارے ہیں۔ ان فواروں کے بعد پھر ایک بڑا حوض پہلے تختہ کی طرح آتا ہے۔ جس کے متصل ایک بہت چوڑا کنواں ہے۔

اس حوض میں تقریباً تیس فوارے ہیں۔ اس کے شمال و جنوب کی طرف فواروں کی دو لائنیں جن میں بیس بیس فوارے ہیں باغ کے آخری دروازوں تک جاتی ہیں۔ حوض سے بائیس فواروں کی ایک اور لائن شروع ہوتی ہے۔ جس کے انجام پر اس تختہ یا شالامار باغ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مہتابی باغ کو اسی باغ سے رستہ جاتا تھا۔ وہ رستہ (دروازہ) اب بھی موجود ہے۔ تینوں باغوں میں آم۔ لیموں۔ کھٹے۔ انار۔ سنگترے۔ ناشپاتی۔ کھجور کے بہت درخت تھے۔ درمیانہ تختہ یا باغ حیات بخش میں جہاں آبشار اور بارہ دریاں اور تخت شاہی اور تالاب کلاں ہے۔ اب درختوں سے بالکل خالی ہے۔ یہاں سے تمام درخت اکھاڑ

دے گئے ہیں۔ اب صرف پہلے تختہ یا تیسرے تختہ میں کچھ درخت نظر آتے ہیں ٭

میلہ شالامار باغ کے شوقین لاہور میں چونکہ بزرگان اسلام کے مزارات بکثرت ہیں اس لئے ان کے عرسوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی میلوں کی وجہ سے لاہور کی یہ مشہور ضرب المثل "آٹھ دن اور نو میلے" بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ان میلوں اور عرسوں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میلہ چراغان یعنی میلہ شالامار باغ کی شمولیت کے لئے اہل لاہور کو کیا کچھ اہتمام نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ باوجود باغ کی اس قدر وسعت کے میلے کے دنوں میں وہاں قدم رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ شالامار کے اندر اور باہر چاروں طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ شالامار کے تیسرے یعنی آخری تختہ سے لیکر باغبانپورہ مزار مادھو لال حسین۔ بھوگی وال۔ سنگھ پورہ۔ سلطانپورہ۔ ریلوے سٹیشن کے نواحات اور دہلی دروازہ بلکہ لوہاری۔ بھاٹی تک آدمیوں کی یکساں کیفیت نظر آتی ہے۔ یہ پیدل رستے کا حال ہے ٭

سڑک پر اس سے بھی زیادہ رونق ہوتی ہے۔ بگھیاں۔ ٹانگے۔ ٹم ٹمیں۔ موٹر۔ سائیکل اس کثرت سے چلتے ہیں کہ ان کا شمار حد و حساب سے باہر ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ لاہور میں گاڑیوں اور ٹم ٹم ٹانگہ کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے۔ موٹر اور سائیکل ان کے علاوہ ہیں۔ بلکہ امرتسر۔ گوجرانوالہ۔ وزیر آباد اور سیالکوٹ تک کے مقامات سے صرف اسی میلہ کی خاطر ٹانگے اور ٹم ٹمیں لاہور میں آجاتی ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ ان تینوں دنوں میں ہر ٹانگہ کو چالیس سے پچاس روپیہ آمدنی ہو جاتی ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر صرف گاڑیوں والے ہی ان تین دنوں میں ایک لاکھ روپیہ کما کر لے جاتے ہیں ٭

لاہور کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے مذہبی تہواروں اور میلوں کی اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی خوشی وہ میلۂ شالامار کی محسوس کرتے ہیں۔ بلا مبالغہ ایک مہینہ پہلے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ بازار میں جوتیاں۔ بوٹ۔ ہر قسم کے کپڑے۔ کپڑوں کی سلائی سب کے نرخ بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے غریب آدمی بھی جن کو بعض اوقات ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل ملتی ہے۔ میلے کے دنوں میں نواب بن کر نکلتے ہیں ٭

میلۂ شالامار کی رونق

مسلمانوں اور سکھوں کے زمانہ میں میلہ صرف ایک ہی دن رہتا تھا۔ اور وہ بھی صرف ہفتہ کے دن۔ ہفتہ کی رات کو عُرس کی وجہ سے مزار مادھولال حسین پر چراغان کی رونق ہوتی تھی۔ اور دن کو تماشائی اور شوقین باغ کی سیر کا لطف اُٹھاتے تھے۔ انگریزوں کے ابتدائی دَور میں بھی پہلے ایک ہی دن میلہ رہتا تھا۔ مگر حکام لاہور نے اس میلہ کی رونق بڑھانے کے لئے اتوار کا بھی اس میں اضافہ کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد لاہور کے شوقینوں نے ہفتہ اور اتوار کے ساتھ جمعہ کا دن بھی شامل کر لیا۔ چنانچہ اب ایک دن کی بجائے میلہ کی رونق تین دن تک رہتی ہے۔ اور ریل کی وجہ سے دُور دُور کے شوقین بھی آ جاتے ہیں۔

باغ کے ہر تختہ میں صدہا دوکانیں نظر آتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ہوٹل عارضی طور پر کھل جاتے ہیں۔ بعض شوقین جمعہ کی سہ پہر کو باغ میں آتے ہیں۔ اور اتوار کی شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ خیمے۔ قناتیں۔ سائبان لگ جاتے ہیں۔ کہیں رقص و سرود کی محفل گرم ہے۔ کہیں ہارمونیم پارٹی کا لطف حاصل ہو رہا ہے۔ کہیں گراموفون کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ تیسرے تختہ میں عام طور پر قلندر۔ مداری بازی گر۔ نٹ اور اسی قسم کے تماشہ کرنے والے نظر آتے ہیں۔

تین دن تک سڑک پر اس قدر چھڑکاؤ ہوتا ہے کہ سال کے باقی ۳۶۲ دنوں کی کسر نکال دی جاتی ہے۔ گلابی باغ کے دروازہ میں پولیس کی عارضی چوکی قائم ہو جاتی ہے۔ باوجود بڑی احتیاط کے پھر بھی کوئی نہ کوئی حادثہ ہر سال ہو جاتا ہے۔ واقف کاروں کا بیان ہے۔ کہ شالامار کے میلہ میں ایک لاکھ سے کم مخلوق نہیں ہوتی۔ جس میں ہندو مسلمان اور سکھ اور دیگر قومیں یکساں شوق و رغبت سے شریک ہوتی ہیں۔ شوقین لوگ میلہ کی خاطر کپڑوں پر جو روپیہ خرچ کرتے ہیں اور جس قدر رقم کرایہ پر خرچ کی جاتی ہے اور جو میلہ کے اندر جا کر دوکانوں پر تفریحات اور کھانے پینے کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ اور جس قدر رقم دوکانداروں کو زمین کے کرایہ کے لئے دینی پڑتی ہے اس کے متعلق ایک واقف کار کا بیان ہے کہ یہ کل رقم دس بارہ لاکھ روپیہ سے کسی طرح

کم نہ ہوگی ۔

باغ شالا مار اور شاہان مغلیہ | شاہجہان کے زمانہ میں اس بے نظیر باغ کی جو حالت رہی ہے وہ باغ کے قطعہ تاریخ "نمونۂ خلد بریں" سے ظاہر ہو رہی ہے۔ شاہ جہان کی زندگی میں دارا شکوہ نے بھی کہ پنجاب (لاہور) اس کی جاگیر میں تھے۔ اس باغ میں اکثر مرتبہ جشن اور جلسے کئے ہیں۔ لیکن اس باغ میں اس کا آخری داخلہ اضطراب انگیز و حسرت خیز ہے۔ اس لئے اس کی کچھ کیفیت بیان کی جاتی ہے۔ شاہجہان کس شان و شکوہ سے ۱۰ شعبان ۱۰۵۲ھ کو اس باغ میں داخل ہوا تھا۔ اب اس کا ولیعہد اور عزیز بیٹا دارا شکوہ اس مصیبت و اضطراب کے ساتھ ۱۲ شوال ۱۰۶۸ھ کو (باپ کی نظر بندی و معزولی کے بعد) باغ کے پہلے تختہ فیض بخش میں آتا ہے۔ کہ عالمگیر اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اور دارا شکوہ اور اس کا بیٹا سلیمان شکوہ اس سے اپنی جان چھپا رہے ہیں۔ پنجاب دارا شکوہ کی جاگیر میں تھا۔ اور عزت خاں اس کا گورنر تھا۔ اس نے سپاہ و خزانہ سے مدد دی۔ استقبال کیا۔ سب کچھ کیا۔ مگر اقبال عالمگیری کے آگے شوکت دارائی کی کوئی پیش نہ گئی۔ دارا شکوہ چار دن تک فیض بخش میں رہا باغ میں اس کے دم سے رونق تو بہت تھی خیمہ و خرگاہ کی کثرت سے ایک شہر آباد تھا۔ لیکن سب کی ہوائیاں چھوٹی ہوئی تھیں۔ عالمگیر یلغار کرتا چلا آرہا تھا۔ دارا نے جب اس کے آنے کی خبر سنی تو ملتان کی طرف بھاگ گیا۔ ۲۴ محرم ۱۰۶۸ھ کو عالمگیر اچھرہ میں قیام کر کے سیدھا شالا مار باغ میں آیا۔ شاہزادہ معظم اور بڑے بڑے امراء ساتھ تھے۔ لوگ بھی ہوا کا رخ اور اس کا بڑھتا ہوا اقبال دیکھ رہے تھے۔ شان و شوکت سے سب نے اس کا استقبال کیا۔ عالمگیر کو دارا شکوہ اور شجاع کا فکر لگا ہوا تھا۔ وہ خلیل اللہ خاں کو پنجاب کی صوبیداری تفویض کر کے محرم کی آخری تاریخ کو لاہور سے چلا گیا۔ اتنے دنوں میں صرف ایک مرتبہ ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں آیا۔ قلعہ کو دیکھا اور ظہر کی نماز مسجد وزیر خاں میں پڑھ کر پھر باغ میں واپس آگیا۔

عالمگیر بھی اپنی طویل سلطنت کے دوران میں لاہور میں چند ایک مرتبہ آیا ہے۔

اور شالامار ہی میں اُس نے قیام کیا ہے۔ مگر اُس کی عمر کا زیادہ حصّہ چونکہ دکن میں بسر ہوا ہے۔ اس لیئے اس کی سب سے بڑی لڑکی زیب النساء اس باغ کو بہت رونق دیتی رہی ہے۔ وہ اپنی صدہا کنیزوں کے ساتھ دنوں اور مہینوں تک اس باغ کی پُرکیف بہار کے لُطف اُٹھاتی رہی ہے۔ بلکہ اس نے خود بھی لاہور میں دو عالیشان باغ تعمیر کرائے ہیں۔ ایک باغ جو میاں بائی کو دیدیا اور جس کا نام اب چوبرجی مشہور ہے۔ دوسرا باغ زیب النساء جہاں اب موضع نواں کوٹ آباد ہے۔

عالمگیر کے زمانہ میں شالامار باغ اپنے پورے عروج پر تھا۔ خلاصۃ التواریخ کا ہندو مصنّف[۱] اس باغ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے "اگرچہ در حوالیٔ شہر فراواں باغ دلکشا و ہزاراں گلشن فرحت افزا است اما باغ شالامار کہ حضرت شاہجہان بادشاہ بہ تقلید باغ کشمیر احداث فرمودہ اند دلفریب نظارگیاں است" (ملاحظہ ہو صفحہ ۶۶)

بہادر شاہ اوّل بہ ایامِ شہزادگی کابل کی آمد و رفت کے وقت بارہا لاہور ٹھہرا ہے۔ اور ہرچند رہائش قلعہ ہی میں رہی ہے۔ لیکن بیگمات اور شہزادے اور شہزادیوں کے ساتھ اس نے اکثر مرتبہ سیر شالامار سے تفریح طبع کے سامان بہم پہنچائے ہیں۔

بہادر شاہ کی وفات سنہ ۱۷۱۲ء میں بعمر ۷۱ سال لاہور ہی میں ہوئی ہے۔ اس کی زندگی ہی میں سلطنت کے کل پُرزے ڈھیلے ہو رہے تھے۔ اس کے بعد کوئی مغل بادشاہ دہلی کے مخمصوں سے باہر نہیں نکل سکا۔ یہ دہلی کا آخری بادشاہ تھا جس نے لاہور کے شالامار باغ کو دیکھا ہے۔

شالامار باغ اور ناظمانِ لاہور | فرخ سیر[۲] کے زمانہ میں جو عالمگیر کا پڑپوتا۔ بہادر شاہ کا پوتا اور عظیم الشان[۳] کا بیٹا تھا۔ جب سنہ ۱۷۱۶ء میں سکھوں نے پنجاب پر بے حد ظلم

[۱] منشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی۔ سنہ تالیف سالِ جلوس ۴۰ عالمگیری۔

[۲] فرخ سیر نے سنہ ۱۷۱۳ء سے سنہ ۱۷۱۹ء تک حکومت کی تھی۔ کہ سادات نے جو بادشاہ گر اس زمانہ میں کہلاتے تھے۔ اس کو اندھا کر کے قتل کرا دیا۔

[۳] بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے۔ محمد معزالدین نے جہاندار شاہ نام رکھ کر دس ماہ تک بادشاہی کی۔ محمد عظیم الشان (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲ پر)

وستم کرنے شروع کردیئے۔ اور لاہور پر گورو بندا نے نہ صرف لوٹ مار ہی کی بلکہ شہر کو آگ لگادی اور بہت لوگوں کو قتل کر دیا۔ تو فرخ سیر نے سکھوں کی تادیب وتنبیہہ بلکہ تباہی وبربادی کا عزم بالجزم کرکے نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو جو ناظم کشمیر بھی رہ چکا تھا اس لئے لاہور کا گورنر مقرر کیا کہ وہ منتظم بھی ہے اور حضرت ایشان کے خاندان سے بھی ہے۔ جن کا مقبرہ لاہور میں تمام مسلمانوں کے نزدیک قابل احترام ہے ۔

جنگجو سکھوں کی تعداد اس زمانہ میں ۳۵ اور ۴۰ ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ نواب عبدالصمد خان نے جس کو سکھ ابو سمند خاں کہتے ہیں۔ ان پر دانہ گھاس اور غلہ یہاں تک بند کیا۔ کہ یہ غول بیابانی بیل۔ گدھے گھوڑے تک کھا گیا۔ آخر بندا اور اس کے ۷۴۰ ہمراہیوں کو اونٹوں اور گدھوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار کرا کے ان کے سروں پر کاغذوں کی ٹوپیاں۔ پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر اپنے بیٹے ذکریا خاں کی حفاظت میں دہلی روانہ کیا۔ جہاں یہ جماعت صحرائی جو عقل و رحم سے خالی اور ظلم وغرور سے بھری ہوئی تھی تیغ کے گھاٹ اتاری گئی۔ بعہد محمد شاہ بادشاہ سنہ ۱۱۳۶ھ کے قریب نواب عبدالصمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نواب ذکریا خان خان بہادر کے خطاب سے سرافراز ہوکر لاہور کا ناظم ہوا۔ نواب عبدالصمد خاں کے زمانہ میں شالامار میں خوب رونقیں رہیں ۔

نواب ذکریا خاں ناظم لاہور

نواب ذکریا خاں ناظم لاہور اور ناصر الدین محمد شاہ فرمانروائے ہندوستان تھا۔ کہ نادر شاہ ایک اُمڈتے ہوئے دریا بلکہ ایک موج زن سمندر کی طرح اٹک۔ جہلم اور چناب کے دریاؤں کو بغیر کسی کشتی یا پل کے عبور کرتا ہوا وزیر آباد پہنچا۔

خجستہ اختر جہاں شاہ۔ رفیع الشان۔ چاروں بھائیوں میں باپ کے بعد تلوار چلی۔ اور فیصلہ لاہور کے باہر جنگ ہوئی۔ عظیم الشان شکست کھا کر ہاتھی پہ سوار ہوکر دریائے راوی سے پار ہو رہا تھا۔ کہ دریا کی طغیانی میں ہاتھی سمیت اس کی تیز لہروں میں بہ گیا ۔

جہاں ناظم لاہور کی فوج نے اس کا مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھا کر واپس لاہور چلی آئی نواب زکریا خاں نادر شاہ کی پیش بندی کے لئے دریائے راوی سے پار آیا۔ شاہدرہ کے قریب تین روز تک خونریز جنگ ہوتی رہی۔ مگر یہاں بھی فتح و نصرت نادر شاہ ہی کو نصیب ہوئی۔ زکریا خاں نے فرار ہو کر لاہور کے قلعہ اور شہر کو مضبوط کیا۔

نادر شاہ ایرانی شالامار میں اور نادر شاہ دریا سے پار ہو کر شالامار باغ میں چلا آیا۔ یہاں خوب جشن کئے۔ فوج کا حوصلہ بڑھایا اور لاہور پر ایک نوبت اور حملہ کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں"

دربار دہلی میں سازشوں کا بازار گرم تھا۔ اُمرائے دربار ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ خود بادشاہ عیش و عشرت میں یہاں تک محو تھا۔ کہ جب ناظم لاہور نواب زکریا خاں کی عرضداشتیں نادر شاہ کے متعلق جاتی تھیں۔ تو حکم ہوتا تھا۔ ع ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اُولیٰ۔ امداد اور کمک شاہی سے مایوس ہو کر ناظم لاہور نے نادر شاہ سے صلح کر لی۔ چنانچہ صلح کا عہد نامہ شالامار باغ میں مرتب ہوا۔ اور اسی جگہ یہ شرائط طے ہوئیں۔ کہ ناظم لاہور خود نادر شاہ کے پاس شالامار باغ میں آ گئے۔

وہ زکریا خاں جو پنجاب کا قریباً خود مختار حاکم تھا۔ اور جو شالامار باغ میں شاہانہ جاہ و جلال سے اُترا تھا۔ دسمبر ۱۷۳۸ء میں اس حیثیت سے شالامار کے پہلے تختہ کی بارہ دری میں جہاں نادر شاہ زرنگار کرسی پر اپنے درباریوں کی مجلس میں اپنے مفتوح و مغلوب کا انتظار کر رہا تھا۔ آیا۔ کہ بیس لاکھ روپیہ نقد اس کے ساتھ تھا اور ر زنجیر فیل بطور نذرانہ ہمراہ تھے۔ نادر شاہ نے چند قدم استقبال کیا۔ اور اپنے پہلو میں دوسری کرسی پر اس کو بٹھایا۔ اور ایک خلعت فاخرہ عطا کر کے اور حکومت پنجاب اُس کے نام پر بحال رکھ کر ۲۹ دسمبر ۱۷۳۸ء کو لاہور سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

نواب یحییٰ خاں ناظم لاہور اس واقعہ کے چار پانچ سال کے بعد نواب زکریا خاں وفات پا گیا اس وقت اس کا چھوٹا بیٹا شہنواز خان صوبہ ملتان تھا۔ اور بڑا بیٹا یحییٰ خاں لاہور میں تھا جو باپ کے بعد صوبہ لاہور مقرر ہوا۔

شالامار کے قریب جنگ تھوڑے ہی دنوں کے بعد دونوں بھائیوں میں ۔۔ کا تنازعہ

شروع ہوا۔ جب نامہ و پیام ناکام رہے۔ تو شہنواز خاں فوج لے کر لاہور پر حملہ آور ہوا۔ شالامار باغ میں اُس نے اپنا قیام کیا۔ اور فوج کو قرب و جوار میں پھیلا دیا۔ یحییٰ خاں بھی فوج لے کر باہر نکلا۔ مگر شکست کھا کر پہلے گرفتار ہو گیا اور پھر بھاگ کر دہلی جا پہونچا جہاں اس کا چچا اور خسر نواب قمرالدین خاں بادشاہ کا وزیر تھا۔ شاہنواز خاں نے دربار دہلی کی اجازت کے بغیر ہی لاہور کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور اس خوشی و مسرت میں شالامار میں ایک عظیم جشن کیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۷۴۶ء کے آخری زمانہ کا ہے ؎

نواب میر معین الملک ناظم لاہور | محمد شاہ کے عہد آخر میں احمد شاہ ابدالی کو سرہند کے قریب جو شکست مارچ سنہ ۱۷۴۸ء میں ملی ہے۔ وہ مغلِ اعظم کی اولاد کی آخری فتح و نصرت ہے۔ اس جنگ میں نواب قمرالدین خاں وزیر اس کا بیٹا نواب میر معین الملک اور ولی عہد سلطنت احمد شاہ بھی شامل تھے۔ وزیر تو مارا گیا۔ مگر اس کے بیٹے نے اپنی شجاعت و قابلیت کے وہ جوہر دکھائے۔ کہ تھوڑے سے ہی دنوں میں پنجاب اور ملتان کا ناظم مقرر ہو گیا ؎

شہزادہ احمد شاہ اور میر معین الملک احمد شاہ ابدالی کی جنگ میں بمقام سرہند دوش بدوش اپنے دشمن کے ساتھ نبرد آزما رہے تھے۔ اس لئے جب اپریل سنہ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ تخت پر بیٹھا تو معین الملک کا اقتدار یہاں تک بڑھ گیا تھا۔ کہ اپنے مدارالمہاموں مصاحبوں اور درباریوں کو اعلےٰ اعلےٰ خطاب وہ اپنے اختیار سے دیتا تھا اور بادشاہ کی طرف سے کوئی پرسش نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے دیوان اور مدارالمہام کوڑا مل کو پہلے دیوان کا خطاب دیا اور جب دیوان نے اس کے بھائی شاہنواز خاں کو ایک جنگ میں قتل کر دیا۔ تو اسے مہاراجہ کا خطاب عطا کر کے ملتان کا گورنر بنا دیا ؎

یہ خود مختاری یہاں تک بڑھی کہ نواب میر معین الملک نے جس کو اہلِ لاہور نواب میر منو کہتے ہیں۔ سنہ ۱۷۵۱ء کے آخر میں جو عہد و پیمان احمد شاہ ابدالی کے ساتھ کئے تھے سب بالائے طاق رکھ دیئے۔ احمد شاہ ایک جرار فوج لے کر بخطِ مستقیم لاہور آیا۔ اور مار دھاڑ کرتا راوی سے پار ہو گیا ؎

احمد شاہ ابدالی شالامار میں | احمد شاہ ابدالی کا یہ تیسرا حملہ تھا۔ اس نے اپنے ڈیرے خیمے

شالامار میں لگائے اور لاہور کے محاصرہ کی تیاریاں شروع کیں۔ چار مہینے تک طرفین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ میر منّو قلعہ اور فصیل شہر کے اندر بند تھا۔ اور ابدالی شالامار میں جشن کرتا اور ارد گرد کے مواضعات کو لوٹتا اور تباہ کرتا تھا۔ آخر رسد رسانی کی قلت سے تنگ ہو کر ۱۲ اپریل ۱۷۵۲ء کو میر منّو اپنے مورچوں سے باہر نکلا۔ اور موضع محمود بوٹی کے قریب دونوں فوجوں میں ایک خونریز لڑائی ہوئی۔ جب نواب کا دیوان مہاراجہ کوڑا مل جو اپنے ولی نعمت کا جاں نثار خیر خواہ تھا۔ اس لڑائی میں مارا گیا تو نواب کی فوج بیدل ہو گئی۔ دوسرے دن میر منّو نے جنگ بیفائدہ سمجھ کر درانی بادشاہ کے پاس شالامار باغ میں اپنے معتبر صلح کا پیغام دیکر بھیجے۔ اور بادشاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ابدالی نے اپنے دربار کے معزز امیر جہان خاں کو میر منّو کے استقبال کے لئے بھیجا۔ بارہ دری میں جو آبشار کے اوپر پہلے تختہ میں ہے دو تخت بچھائے گئے۔ بادشاہ میر معین الملک کے آنے پر سرو قد ایستادہ ہوا۔ اور اس کی شجاعت و بہادری کی کمال تعریف کی۔ آخر بہت سی باتوں کے بعد اس شرط پر صلح ہوئی۔ کہ ناظم لاہور بادشاہ کو پچاس لاکھ روپیہ نقد اور چند راس اسپ معہ زین طلائی اور چند زنجیر فیل معہ ہودج نقرہ پیش کرے میر منّو نے یہ شرط منظور کر لی۔ اور احمد شاہ نے جالندھر۔ لاہور اور کوہستان کی سند حکومت اسے لکھ دی۔ اور خلعت قیمتی سوا لاکھ روپیہ معہ ایک بیش بہا مرصع کار تلوار کے عطا فرمایا۔

سکھ حاکمان لاہور کا زمانہ

احمد شاہ ابدالی کے چوتھے حملہ پنجاب ۱۷۵۶ء کے بعد سکھ پھر جنگلوں اور جھاڑیوں سے باہر نکلے۔ اس موقعہ پر ان کا سردار جسا سنگھ کلال قوم کا ترکھان تھا۔ اس نے مغلوں کے دار الضرب واقعہ لاہور پر قبضہ کر کے حسب ذیل سکہ اپنے نام کا چلایا۔ "سکہ زد بفضل خالصہ بملک احمد شاہ مفتوحہ جسا کلال"۔ یہ سب سے پہلا سکہ تھا۔ جو سکھوں نے جاری کیا۔ جب احمد شاہ ابدالی کو سکھوں کی اس قسم کی خبریں ملیں تو سنہ ۱۷۶۲ء میں وہ پھر ان کی گوشمالی کے لئے کابل سے نکلا۔ سکھ حسب دستور پھر فرار ہو گئے۔ مگر احمد شاہ نے ان کو ستلج کے پار جا پکڑا۔ جہاں فروری ۱۷۶۲ء میں سکھوں کا قتل عام ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اس لڑائی میں جو لودھیانہ سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر گوجرال

وبرنالہ کے درمیان ہوئی ہے۔ بارہ ہزار سے زیادہ سکھ تہ تیغ ہوئے ٭

اسی اثناء میں اُسے بغاوتِ قندھار کی خبر ملی۔ وہ آلا سنگھ کو بعوض سات لاکھ روپیہ پٹیالہ کا راجہ اور دیوان کابلی مل کو صوبہ لاہور مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ سکھوں نے پھر سر نکالا۔ اور ان کی مشہور بارہ مثلوں میں سے بھنگیوں کی مثل نے گوجر سنگھ۔ لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے ماتحت مضافات کو لُوٹنے کے بعد لاہور پر حملہ کیا۔ کابلی مل کئی ماہ تک جنگ کرتا رہا۔ آخر مقابلہ کی تاب نہ لایا اور بھاگ گیا۔ دوسرے دن بھنگی مثل والوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا ٭

ان کے بعد احمد شاہ ابدالی اور تیمور شاہ پسر احمد شاہ اور شاہ زمان نے سنہ ۱۷۹۹ء تک پنجاب پر کئی حملے کئے۔ لیکن سکھ اب زور پکڑ رہے تھے۔ اور رنجیت سنگھ نشوونما پا رہا تھا۔ اس لئے سب حملے قریباً ناکام رہے ٭

سنہ ۱۷۶۵ء سے سنہ ۱۷۹۹ء تک یعنی کامل ۳۴ سال پنجاب بالخصوص لاہور و مضافات لاہور کے لوگ اور ان میں بھی بدنصیب مسلمان ہمیشہ مصائب و آلام کا شکار رہے۔ جن تین بھنگی مثل کے سرداروں نے لاہور کو فتح کیا تھا۔ انہوں نے لاہور کو حسب ذیل حصص میں تقسیم کر لیا۔

گوجر سنگھ بھنگی کے قبضہ میں لاہور کا وہ علاقہ تھا۔ جو شالامار باغ اور لاہور کے درمیان واقعہ ہے۔ گوجر سنگھ کا قلعہ اسی سردار کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور پر جب رنجیت سنگھ نے قبضہ پایا ہے۔ تو گوجر سنگھ کا بیٹا صاحب سنگھ باپ کا جانشین تھا ٭

دوسرے حاکم کا نام لہنا سنگھ تھا۔ حملۂ رنجیت سنگھ کے وقت اس کا بیٹا چیت سنگھ اپنے علاقہ شہر اور قلعہ پر قابض تھا ٭

تیسرا حاکم سوبھا سنگھ تھا۔ اس کے قبضہ میں لاہور اور باغ زیب النساء یعنی نواں کوٹ کا درمیانی علاقہ تھا ٭

؎ حاکمانِ لاہور کے زمانہ میں شالامار کی تباہی شروع ہوتی ہے۔ لہنا سنگھ ہی وہ حاکم ہے جس نے سنگِ یشب کا حوض تلاش کرا کر ۲۵ ہزار اور بقولِ جج محمد لطیف مورخ لاہور

۴۲ہزار کو حکاکوں کے پاس فروخت کر دیا تھا۔

رنجیت سنگھ اور شالامار

رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کیا۔ اور شروع ۱۸۰۶ء تک اس نے بہت سی فتوحات حاصل کر لیں۔ جب جنگی کاموں سے ذرا مہلت ملی۔ تو پہلا کام یعنی اپریل ۱۸۰۶ء میں دو وجوہات سے شالامار باغ کی طرف توجہ کی۔ ایک تو یہ کہ باغبانپورہ کے رؤساء نے لاہور کا قبضہ دلاتے وقت رنجیت سنگھ سے شالامار باغ کی حفاظت و مرمت کا وعدہ لے لیا تھا۔ اور دوسرے اس خیال سے کہ آخر وہ ایک اعلےٰ ترین بادشاہی مقام ہے باغ کی اکثر جگہ سے مرمت کرائی گئی۔ اور اس نہر کو جو ناظمان لاہور کے بعد سکھ سرداروں کے حسن انتظام اور مذاق سلیم کی وجہ سے قریباً پچاس سال سے بند چلی آتی تھی۔ از سر نو جاری کرایا۔ اور باغ میں پھر وہی رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی۔

رام باغ امرتسر اور دربار صاحب امرتسر میں شالامار باغ کا سنگ مرمر

امرتسر چونکہ سکھوں کا مذہبی مقام ہے۔ اس لیے رنجیت سنگھ اکثر وہاں جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی دن وہاں رہتا تھا۔

جب تمام پنجاب بلکہ شمال کی طرف پشاور تک اس کا قبضہ ہو گیا۔ اور مغربی پنجاب کے تمام مسلمان رؤسا اور قصور۔ مالیر کوٹلہ۔ ملتان۔ بہاولپور وغیرہ کے تمام مسلمان والیان ریاست اس سے خوف کھانے لگے۔ تو باغبانپورہ والوں کی کیا طاقت تھی۔ کہ وہ رنجیت سنگھ کو شالامار کی حفاظت و مرمت کے وعدوں کا پابند بنا سکتے۔ چنانچہ جب امرتسر کے دربار صاحب اور رام باغ کی عمارتیں بننا شروع ہوئیں۔ اور ان میں سنگ مرمر لگایا جانا تجویز ہوا۔ تو لاہور کی دیگر اسلامی عمارتوں اور مقبروں کی طرح شالامار باغ کی بھی شامت آئی۔ یہاں کی بارہ دریوں کے فرش جو سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے تھے۔ اتار کر امرتسر پہنچا دیے گئے۔ اور شالامار باغ اور لاہور کی دیگر شاہی عمارات کو اجاڑ کر امرتسر کا رام باغ اور دربار صاحب آباد کیا گیا۔

شالامار باغ میں عظیم الشان جشن

رنجیت سنگھ نے اوائل مارچ ۱۸۳۷ء میں اپنے پوتے یعنی شہزادہ کھڑک سنگھ کے بیٹے نونہال سنگھ کی شادی پر علاوہ راجگان جنوبی پنجاب و کوہستان اور دیگر جاگیردار اور امراء کے گورنر جنرل سر چارلس مٹکاف

اور سر ہنری فین کمانڈر انچیف افواج ہند کو بھی دعوت دی۔ انگریز مہمانوں میں سے صرف آخر الذکر ۶ مارچ ۱۸۳۷ء کو امرت سر آئے۔ جہاں سے برات شام سنگھ اٹاری والا کے ہاں جانے والی تھی۔ یہ شادی پنجاب میں عہد رنجیت سنگھ کی بہت بڑی یادگار ہے۔ دیگر اخراجات شادی کے علاوہ صرف غرباء ہی کو گیارہ اور بیس لاکھ روپیہ کے درمیان خیرات کیا گیا تھا۔ تمنبول کی رقم پچاس لاکھ روپیہ تھی۔ سپہ سالار ہند نے پندرہ ہزار روپیہ دیا تھا۔

شادی کے کاروبار سے فارغ ہو کر رنجیت سنگھ سر ہنری فین سپہ سالار افواج انگلشیہ کو شالامار کی سیر کرانے کے لئے لاہور لایا۔ اور ایک دن اور ایک رات دونوں معہ اپنے درباریوں اور افواج کے باغ ہی میں رہے۔ اعلیٰ پیمانہ پر مہاراجہ نے اپنے معزز مہمان کی دعوت کی۔ رجمنٹ ۱۳ پیدل انگریزی اور مہاراجہ کی فوج کے باجہ نواز باری باری سے باجہ سنا کر حاضرین کو مسرور کرتے تھے۔ محفل رقص و سرود جس میں لاہور و امرت سر کی منتخب طوائفین شامل تھیں تمام شب گرم رہی۔ اور جیسا کہ اس قسم کی شاہانہ محفلوں کا دستور ہے۔ شراب انگوری کا دور برابر جاری رہا۔

شالامار میں آتش بازی اور چراغاں

مہاراجہ نے بڑے اہتمام سے روشنی اور آتش بازی کا سامان کیا۔ حوضوں اور آبشاروں کے کناروں سے لے کر بے شمار گنجان درختوں کی چوٹیوں تک چراغوں کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں میں رنگ برنگ کی قندیلیں آویزاں کرائیں۔ اور ایک ایک درخت کے ساتھ روشنی کی پچاس پچاس ہانڈیوں کا انتظام کیا گیا۔ حوضوں کے گرد چراغوں کی دو طرفہ قطاریں کمال لطف دکھاتی تھیں۔ اور جب ان کی جھلک پانی میں پڑتی تھی۔ تو عجیب طرح کا عالم نظر آتا تھا۔ اسی طرح قندیلوں اور ہانڈیوں کی روشنی میں میوہ دار درختوں کے سرسبز پتے اور ان کی ہری ہری شاخیں آنکھوں کو ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں

۱؎ از تاریخ پنجاب مطبوعہ ۱۸۸۹ء مصنفہ خان بہادر سید محمد لطیف جج مرحوم۔

کو دیکھنے والے کے دل سے وہ لطف کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔

مہاراجہ اپنے معزز مہمان کے ہمراہ بارہ دری کلاں میں جو آبشار کلاں کے سر پر شالامار کے پہلے تختہ میں ہے۔ بیٹھے ہوئے باغ کی تمام کیفیت ملاحظہ کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک بلند چبوترہ پر لیڈیوں کے لئے نشستگاہیں بنائی گئی تھیں۔ بارہ دری کے اندر ہی تمام معزز امراء وغیرہ آتشبازی اور روشنی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ایک انگریز سیاح کا قیام شالامار میں

۱۸۲۳ء میں ایک انگریز سیاح ہنری مور کرافٹ مہاراجہ کے دربار میں آیا جس نے کشمیر، تبت، بخارا، قند وغیرہ کا سفر بھی کیا ہے۔ اور جس کو مہاراجہ کے حکم سے دیوان موتی رام ناظم کشمیر نے اس کے اغراض کے لئے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی تھی۔ ۱۸۳۰ء میں کہ ابھی مہاراجہ زندہ تھے اس نے واپس لنڈن میں جا کر اپنا سفر نامہ چھپوایا۔ جو بہت مشہور ہوا۔ اسی سفرنامہ میں صـ ۹۱ پر مور کرافٹ نے شالامار باغ کا کچھ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ میں ۲۰ مئی کو لاہور پہنچا۔ مہاراجہ نے شالامار باغ میں جو شاہجہان کا بنایا ہوا ہے۔ میرے لئے ایک خیمہ نصب کرایا۔ وہ خیمہ کہاں تھا۔ مور کرافٹ لکھتا ہے "میرے خیمہ کے پاس ایک کنواں تھا۔ اور اس کے پاس ہی ایک وسیع تالاب تھا جس سے فوارے علی التواتر چلتے تھے اور جن سے ہوا نہایت سرد ہو جاتی تھی"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا خیمہ باغ کے پہلے ہی تختہ در بارہ دری کے متصل تھا جس کے نیچے آبشار اور فوارے اور ساون بھادوں اور وسیع تالاب ہے ٭ کنوئیں کے اوپر جو بارہ دری ہے اسپر سیاہ ند کور کا نام لکھا ہوا ہے

رنجیت سنگھ نے اس باغ کی بہت کچھ مرمت کرائی ہے۔ باغ کی چار دیواری کے اندر متعدد عالیشان عمارتیں ہیں۔ ساون بھادوں کا نظارہ نہایت دلفریب ہے۔ شام کو وہاں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ اور سب پانی کی بوندیں ان کے اوپر سے گذرتی ہیں اور قطرہ قطرہ ہو کر واپس آتی ہیں تو نہایت لطف پیدا ہوتا ہے۔

باغ کی سطح گیلریوں کی طرح درجہ بدرجہ بنائی گئی ہے۔ ہر طبقہ اور درجہ میں ثمردار درخت بکثرت لگے ہوئے ہیں۔ اس باغ کے لئے اسی کوس کے فاصلہ سے پانی آتا ہے۔ دروازے تمام چینی کے بنے ہوئے ہیں۔ یعنی مٹی پر چینی کا کام ہے۔ بعض مقامات پر خوبصورت سنگ مرمر کے نقشی پتھر پائے جاتے ہیں۔

رنجیت سنگھ اور موراں طوائف کے عشق کا تعلق شالامار باغ سے

رنجیت سنگھ باغات اور گل و گلزار کا بہت شوقین تھا۔ اس لئے کبھی کبھی شالامار کی سیر کو آ نکلتا تھا۔ امراء وزراء سب جلو میں ہوتے تھے۔ اور یہ جگہ مہاراجہ کی خوش طبعی کا لطف اٹھاتے تھے مہاراجہ بسنت دسہرہ اور ہولی کے تیوہاروں پر بھی اس باغ میں آتا تھا۔ اور جس جاہ و جلال سے آتا تھا اس کا تصور آج خواب میں آنا بھی دشوار ہے۔ منتخب حسین رنڈیاں باغ فرح بخش کی بارہ دری کو اندر کا اکھاڑہ بنا دیتی تھیں اور اپنے دل آویز نغموں سے مہاراجہ کے دل کو خوش کرتی تھیں۔ بسنت کے ایک موقع پر شالامار باغ میں اسی قسم کا ایک جشن ہو رہا تھا۔ بارہ دری میں لاہور و امرتسر کی مشہور خوبصورت طوائفیں مجمع کو پرستان بنا رہی تھیں۔ کہ مہاراجہ نے ایک نوجوان خوش قسمت طوائف کو جو سراپا حجاب بنی تھی دیکھا۔ تیر نگاہ کلیجہ سے پار ہو گیا۔ حکم دیا۔ سوائے اس طوائف کے باقی تمام طوائفوں کو انعام و اکرام دیکر رخصت کر دو۔ اس کا نام موراں تھا۔

یہ وہ موراں ہے جس کے نام پر شاہ عالمی دروازہ کے اندر ایک مسجد بنام مسجد موراں والی لاہور کے متصل ایک موضع موراں والا ایک چاہ موراں والا اور ایک باغ موراں والا مشہور ہے۔ اور جس نے یہاں تک مہاراجہ پر قابو پا لیا تھا کہ موراں کے نام کا سکہ بھی پنجاب میں چل گیا۔ اور مہاراجہ کے دربار کے بڑے بڑے مغرور و معزز مصاحب اور مونچھوں پر تاؤ دینے والے سردار موراں کی کفش برداری کی عزت دو جہان کی نعمت سے کم نہ سمجھتے تھے۔ غرض اسی باغ سے مہاراجہ اور موراں کے عشق و محبت کا افسانہ شروع ہوتا ہے۔

مہاراجہ شیر سنگھ کی فوجکشی شالامار باغ پر۔

مہاراجہ کھڑک سنگھ کے زمانہ میں شالامار باغ کے متعلق کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ البتہ جب ۱۸۴۱ء میں شہزادہ شیر سنگھ پنجاب کا فرمانروا ہوا۔ تو اس نے اور اس کے وزیر راجہ دھیان سنگھ نے سوار اور پیدل فوج کی تعداد کثیر کے ساتھ شالامار باغ پر فوجکشی کی جس کی مختصر سی کیفیت اس طرح ہے۔ کہ مہاراجہ شیر سنگھ کا ایک معتبر اور جان نثار سردار جوالا سنگھ نام تھا۔ مہاراجہ نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر ہم خاندان ڈوگرہ کی مدد کے بغیر لاہور اور قلعہ پر قابض ہوگئے تو مدار المہامی کی سند تمہارے نام لکھ دی جائیگی۔

اس قسم کی باتیں راجہ دھیان سنگھ کے دل میں کھٹک رہی تھیں۔ اس نے مہاراجہ کو جوالا سنگھ کی طرف سے بھڑکانا شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ یہاں تک کامیاب ہوگیا کہ مہاراجہ اپنے قدیمی خیرخواہ کو اپنا جانی دشمن تصور کرنے لگا۔

مہاراجہ ایک مرتبہ غم وغصہ کے اضطراب میں تھا۔ کہ دھیان سنگھ نے موقعہ مناسب دیکھ کر جوالا سنگھ کے متعلق کچھ جھوٹ موٹ کہہ دیا اور اس قسم کی خانہ ساز باتوں کا طوفان اُٹھایا جس سے مہاراجہ اور بھی بھڑک اُٹھا اور حکم دیا۔ کہ جوالا سنگھ کو ابھی دربار میں حاضر کیا جائے۔ جوالا سنگھ اُس وقت اپنے چھ ہزار سواروں کے ساتھ شالامار باغ کے اندر مقیم تھا۔ اس نے مہاراجہ کی نیت بخیر نہ سمجھ کر حاضری سے انکار کردیا۔ راجہ دھیان سنگھ نے اس پر اور بھی نمک چھڑکا۔ اور مہاراجہ کو اس پر فوجکشی کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ مہاراجہ اور وزیر دونوں ایک جرار فوج لیکر شالامار باغ کیطرف گئے۔ جوالا سنگھ نے جب سنا کہ مہاراجہ فوج کثیر لئے آ رہا ہے تو وہ بلا توقف مہاراجہ کے کیمپ میں حاضر ہوگیا اور اسطرح شالامار باغ میں جو خونریزی ہونیوالی تھی وہ رک گئی۔

مہارانی جنداں شالامار باغ میں

جب مہاراجہ شیر سنگھ کے قتل کے بعد مائی جنداں والدہ مہاراجہ دلیپ سنگھ اپنے صغیر سن بیٹے کی سرپرست قرار پائی۔ تو اُسنے اور اُس کے منظور نظر نوجوان راجہ لال سنگھ نے سکھ سپاہ کی طاقت کو توڑنے بلکہ اُس کو تباہ کرنے کیلئے یہ تجویز سوچی کہ اس کو انگریزوں کے خلاف اشتعال دلا کر آمادہ جنگ کردیا جائے۔ تاکہ یہ خود سر اور بے لگام فوج جو ذاتی طمع اور لوٹ مار کیلئے نہ کسی راجہ کا ادب کرتی

ہے نہ کسی وزیر کا۔ نہ ملک کے ناموس کا اس کو خیال ہے اور نہ رعایا کے تباہ ہونے کا۔ سیدھی ہو جائے ٭

اس تجویز کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے بہت سی جعلی چٹھیاں بنائی گئیں اور تمام ملک میں مختلف ذرائع سے ان کی تشہیر کی گئی آخر جب عام سکھوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف ایک جوش پیدا ہو گیا۔ اور فوج لڑنے مرنے کے لئے تیار نظر آنے لگی۔ تو راجہ لال سنگھ اور رانی جنداں نے کل سرداروں۔ افسروں اور فوج کے پنچوں کا شالامار باغ میں ایک دربار منعقد کیا جس میں دیوان دینا ناتھ (بعہدِ انگریزی راجہ دینا ناتھ) نے اس مضمون کی ایک چٹھی پڑھی "انگریزوں کا پختہ ارادہ ہے کہ ستلج پار ہو کر سکھوں کے ملک میں شورش پیدا کریں۔ اور آخر اس تمام سرسبز ملک پر قبضہ کر لیں۔ دربار لاہور کے جو کاروار ستلج پار مقیم ہیں۔ انگریز ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں۔ انہوں نے دیہات کے لوگوں کو یہ حکم بھی دیدیا ہے۔ کہ وہ آیندہ معاملہ یا خراج سکھوں کی بجائے انگریزوں کو دیا کریں گے۔ دیوان دینا ناتھ نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ پشاور اور کشمیر وغیرہ دور دراز حصص ملک میں غدر مچا ہوا ہے۔ ایک عرصہ سے وہاں سے مالیہ کی رقم نہیں آئی۔ ہمارا بادشاہ بھی ایک صغیر سن لڑکا ہے۔ جب تک کوئی سرکردہ نہ ہوگا۔ اور امورات سلطنت کی انجام دہی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ اتنی بڑی مملکت کا کام کس طرح چلیگا۔ اس لئے مہارانی جنداں کا یہ منشا ہے کہ راجہ لال سنگھ کو وزارت اور سردار تیجا سنگھ (بعہدِ انگلشیہ راجہ تیجا سنگھ) کو سپہ سالاری کا عہدہ دیا جائے۔ مہارانی یہ بھی چاہتی ہیں۔ کہ سپاہ خالصہ ستلج پار ہو کر انگریزوں کو کافی سزا دے۔ اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی لاج قائم رکھے"۔

اس تقریر کے جواب میں کل سرداروں اور پنچوں نے جوش و خروش کا اظہار کیا راجہ لال سنگھ اور سردار تیجا سنگھ نے اپنی اپنی تقریروں میں فوج خالصہ کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہو گیا ٭

ﻟﮧ یہ چٹھی رئیسانِ پنجاب مولفہ سر لیپل گریفن میں مفصل درج ہے ٭

رانی جنداں جلسہ کے بعد بھی دو تین دن تک شالامار باغ میں مقیم رہی۔ اور وہاں اپنی کنیزوں لونڈیوں اور اپنے معتبروں کے ساتھ صلاح و مشورے کرتی اور داد عشرت دیتی رہی۔ یہ واقعہ جو نہ صرف سکھ فوج بلکہ سکھ سلطنت کی تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ اوائل نومبر ۱۸۴۵ء کا ہے ٭

سرکار انگریزی اور شالامار باغ

الحاق پنجاب (۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء) کے بعد سرکار انگریزی نے جس طرح اس اُجڑے ہوئے ملک کو آباد کرنے اور مخلوق خدا کو متعصب حاکموں کے ظلم و تعدی سے بچانے کا اعلان کیا۔ اسی طرح لاہور کی قدیمی عمارات خصوصاً شالامار باغ کی رونق و آبادی کیطرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ اب تک شالامار کی مرمت کے لئے ہر سال معقول رقم منظور ہوتی ہے ٭

مسلمانوں اور سکھوں کے زمانہ میں میلہ صرف ایک ہی دن رہتا تھا۔ مگر سرکار انگریزی نے اس میلہ کے لئے دو دن مقرر کر دیئے۔ اور محض اسی میلہ کی خاطر ایک دن کی چھٹی سرکاری دفاتر میں منظور کی۔ اور گھوڑوں کی منڈی بھی اسی میلے کیساتھ مقرر کر دی۔ جہاں اچھے اچھے گھوڑوں کو انعام بھی ملتا تھا۔ اور بعض خاص نسل کے گھوڑے بڑی بڑی قیمت بھی پاتے تھے۔

جب جنوری ۱۸۷۶ء میں پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہفتم آنجہانی) اور ان کے بعد امیر کابل لاہور میں آئے تو شالامار باغ میں اس قدر روشنی کی گئی تھی۔ کہ یہ باغ ایک نوری باغ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی شب تار میں اُس وقت وہ روشنی تھی کہ روز روشن کو اس سے شرم آتی تھی ٭

جس قدر والیسرایانِ ہند لاہور آتے رہے ہیں۔ اُن سب نے اس عالیشان باغ کی سیر کی ہے۔ جب ۱۸۹۳ء میں لارڈ ایلجن لاہور آنے تھے۔ تو راقم الحروف[1] کو خوب یاد ہے۔ کہ پندرہ بیس دن پہلے ہی باغ میں عوام الناس کو جانے کی ممانعت ہو گئی تھی۔ اور کئی دنوں تک باغ کی صفائی اور مرمت ہوتی رہی تھی۔ اسی طرح جب ۱۹۰۵ء

[1] مصنف کتاب ہذا اس زمانہ میں لاہور پڑھتا تھا ٭

ہیں لارڈ کرزن جو آجکل انگلستان کے وزیر خارجہ ہیں اور اُس زمانہ میں ہندوستان کے وائسرائے تھے سلاہور آئے۔ تو شالامار باغ کی عمارتوں میں بہت کچھ مرمت اور باغ کے وسیع احاطہ میں بہت کچھ صفائی ہوگئی تھی۔ ہز میجسٹی امیر حبیب اللہ خان مرحوم والئ کابل جب ۱۹۰۷ء کے اوائل میں سیاحت ہند کو آئے۔ تو بہ ایام قیام لاہور ۴ مارچ کو صبح دس بجے شالامار باغ میں بھی گئے۔ سر مہری میک موہن اور دیگر درباری آپ کے ہمراہ تھے۔ قاضی غلام ربانی صاحب مرحوم خان بہادر نے جو ہز میجسٹی کے سیر شالامار کے مہتمم تھے۔ باغ کے تمام تختے ہز میجسٹی کو دکھائے۔ ایک بجے بعد دوپہر امیر صاحب موٹر پر سوار ہو کر واپس آگئے ٭

پارہ ماہ تک چاہ بالکل ویران پڑا رہتا تھا۔ اب گورنمنٹ کی توجہ سے اس کی مرمت ہوگئی ہے۔ اس سے پانی نکالنے کے لئے ایک انجن لگایا گیا ہے۔ جو ہفتہ میں تین مرتبہ چلتا ہے۔ اور جس سے فواروں میں پانی پہنچایا جاتا ہے ٭

موجودہ شہنشاہ ہندوستان و شاہ انگلستان یعنی ملک معظم جارج پنجم بھی زمانہ شہزادگی شالامار باغ میں رونق افروز ہوئے تھے۔ باغ اس موقعہ پر بے حد سجایا اور آراستہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح ان کے ولیعہد موجودہ پرنس آف ویلز بھی ۱۹۲۱ء کی سیاحت ہند میں شالامار باغ کی سیر سے محظوظ ہوچکے ہیں ٭

شالامار باغ لاہور شاعروں کی نظر میں

شالامار باغ کی سیر کے بعد کئی اہل دل شعراء نے اس کیفیت کو جو اُن کے دلوں نے محسوس کی تھی کلام موزون (نظم) کے ذریعہ ظاہر کیا ہے میں یہاں صرف دو نظمیں لکھتا ہوں۔ جو دوران ترتیب کتاب ہذا میں مجھے ملی ہیں ٭

لے ۲۲ نومبر ۱۹۲۳ء کو لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آجانے اور اس کے لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے وزیر اعظم مقرر ہو جانے سے لارڈ کرزن کو وزارت خارجہ سے بوریا بستر اٹھانا پڑا۔ آج کل آپ نپولین بوناپارٹ کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں ٭

(از ڈاکٹر عبد الحکیم صاحب بسمل ہوشیار پوری)

چل رہی ہے گلشنِ عالم میں عبرت کی ہوا
آ رہی ہے ہر گلِ خوش رنگ سے بوئے فنا
نغمۂ حسرت ہے ہر دم عندلیبِ خوشنوا
غنچۂ لب بستہ سے پیدا ہے ماتم کی صدا
قمری کوکو نواء کی گفتگو سے ہے عیاں
ہائے پہلا سا ہے اب وہ منظرِ دلکش کہاں

سوز و سازِ نغمۂ مرغانِ خوش آہنگ تھا
سرو تھا طنبور ہر برگِ شجر اک چنگ تھا
رقصِ طاؤسانِ بستان کا نرالا ڈھنگ تھا
لالہ ہم کیفیتِ جامِ مئے گلرنگ تھا
تھی صبا مجرائی دربارِ شاہنشاہِ گل
مرجعِ بلبل نگاہاں تھی کبھی درگاہِ گل

کیا غضب ڈھایا یہ تو نے حیف اے دورِ زماں
کر دیا اس جنتِ ارضی کو پامالِ خزاں
اب نہ وہ سنبل نہ وہ لالہ نہ وہ سرو چماں
تختہ ہائے گل اڑائے صورتِ تختِ رواں
اے فلک کیا تھا اسی صورت میں یہ شہوار باغ؟
یوں ہی بے برگ و نوا تھا آہ! شالامار باغ؟

منتخب تھا اس چمن زارِ جہاں میں یہ چمن
تھے ثنا خوانوں میں لاکھوں لالہ رخ غنچہ دہن
گلشن آرا تھے ہزاروں سرو قد گل پیرہن
خود ہوا خواہوں میں اس کے تھے شہنشاہِ زمن
ناز پروردِ توجہ ہر گلِ رعنا رہا
شاہجہاں اس باغ کا برسوں چمن پیرا رہا

آبشاروں کی روانی اور نہروں کی جھلک
پانی پانی کیوں نہ ہوتے کوثر و تسنیم تک
گوہرِ شبنم کی زینت اور زرِ گل کی چمک
ہائے کیوں دیکھی گئی تجھ سے نہ اے چشمِ فلک
محوِ شالامار تھیں پریاں پرستاں چھوڑ کر
دیکھنے آتی تھیں حوریں باغِ رضواں چھوڑ کر

آفریں صد آفریں اے ہمتِ شاہجہاں
ہے زمانہ میں یہ تیری خوش نصیبی کا نشاں
یاد تازہ ہے تری جب تک ہے نقشِ گلستاں
تیری عالی ہمتی ہے اس عمارت سے عیاں

ساتِ تختوں میں سجائی تو نے ایسی گل زمیں
آٹھ گلشن خلد کے ہوتے تھے جس سے شرمگیں

حشمت و شوکت تری اے خسروِ والا گہر — خطِ ریحاں میں لکھی ہے صفحۂ تاریخ پر
گرچہ تیری قوم ہے اب طائرِ بے بال و پر — دیکھتی ہوگی جہاں کے انقلابوں کو مگر

تھا ہمائے جلوہ تیرا جس جگہ سایہ فگن
اب وہاں رکھتے ہیں طرح آشیانِ زاغ و زغن

آج اے بسمل وہ شیدائے قدامت ہیں کہاں؟ — دیکھتے ہیں جو اس آئینے میں آثارِ جہاں
اس طرف بھی وہ سمندِ عزم کی پھیریں عناں — مٹ نہ جائے آہ نقشِ یادگارِ رفتگاں

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن اے ہوشیار
تا بماند نامِ نیکت تا قیامت برقرار

(از خان احمد حسین خانصاحب بی۔ اے پنشنر جج و ایڈیٹر شباب اردو۔ لاہور)

اے شالامار باغ یہ کیسی بہار ہے — گلگونۂ خزاں ترا یاسی سنگھار ہے
ہر گل مثالِ غنچۂ سنگِ مزار ہے — ہر لالہ مثلِ داغِ دلِ بے قرار ہے

کیوں اڑ رہی ہیں چہرۂ گل پہ ہوائیاں — کیوں دے رہی ہے بلبلِ بیدل دوہائیاں

ہر پھول دم بخود ہے گریباں دریدہ ہے — فوارہ آبلے کی طرح آب دیدہ ہے
گلبانگِ مرغ نالۂ حلق بریدہ ہے — خوشبوئے باغ نکہتِ بادِ وزیدہ ہے

تو باغِ پُر فضا ہے کہ حسرت لباس ہے — جو تجھ کو دیکھتا ہے وہ ہوتا اداس ہے

بیمار ہے؟ مریض ہے؟ تو نیم جان ہے؟ — کل لالہ رو تھا آج گلِ زعفران ہے
گل زمزمہ نواؤں کا اب نوحہ خوان ہے — کیا تو ہی یادگارِ شہ شاہجہان ہے؟

سرتاجِ تاج حامیِ اربابِ باکمال — آئیں جو پھر تو کیا کہیں؟ دنیا کی ہے یہ چال

کھول آنکھ دیکھ چاک ہوا پردۂ ممات — اور پھر سیر آئی ہے ممتاز نیک ذات
پھر زیبِ تن ہے نامِ خدا جامۂ حیات — الفت کی شان آئی ہے کس شان کی برات

طاؤس زرنگار اٹھائی ہوئی ہیں تخت
آزردہ مت ہو لینا ہے جو شالا باغ لے
او بے چراغ لے مری سینے کے داغ سے
الله میاں جو چاہیں تم یوں جاگتا ہے بخت
کیوں بد دماغ ہے مزا عالی دماغ سے
شبنم کو چھوڑ دیدۂ تر کا ایاغ لے
دن رات تیرے واسطے آنسو بہاؤنگا
اور زیر آبشار چراغاں دکھاؤنگا

دیگر مقامات کے شالامار باغ

عام خیال یہ تھا۔ کہ شالامار باغ کشمیر میں ہے یا لاہور میں۔ ان کے سوا ہندوستان میں اس نام کا اور کوئی باغ نہیں ہے۔ ایک باغ البتہ اس نام کا کابل میں بتایا جاتا ہے۔ لیکن کسی کتاب اور کسی تاریخ میں "شالامار باغ کابل" کا کچھ تذکرہ نہیں دیکھا البتہ "باغ بابر" کا ذکر اکثر کتابوں میں آیا ہے۔ ظفر خاں احسن نے جو جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں کابل و کشمیر کا گورنر رہا ہے۔ کابل و کشمیر کی تعریف میں ایک مثنوی "بے نظیر" کے نام سے لکھی ہے۔ اگر کابل میں شالامار باغ کا وجود ہوتا۔ تو وہ کابل کے دیگر باغات کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی کرتا۔ لیکن اس نے اپنی مثنوی میں کابل کے شالامار باغ کا کہیں نام بھی نہیں لیا۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں کشمیر کے شالامار اور نشاط باغ کی تعریف میں وہ مستانہ وار جھومتا نظر آتا ہے ؂

لاہور کے شالامار باغ سے پہلے اس نام کا صرف ایک باغ کشمیر میں احداث کیا گیا تھا۔ باقی تمام باغات جو پنجاب اور ہندوستان کے دیگر ممالک میں شالامار باغ کے نام پر ہیں سب لاہور کے شالامار کے بعد بنائے گئے ہیں۔ اور بعض تو ان میں سے بھی برباد حال ہی کے ہیں۔ ان باغات کے کچھ حالات یہاں درج کئے جاتے ہیں ؂

کے نام شالامار ہیں۔ اور جن کا سلسلہ کشمیر جنت نظیر کی پُر فضا وادی سے لے کر دہلی کی دیواروں تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جن میں سے اکثر کے دیکھنے کا مصنف اوراق ہذا کو بھی اتفاق ہوا ہے۔ یہ باغات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کشمیر کا شالامار باغ جس کی تقلید میں شالامار باغ لاہور تعمیر کیا گیا۔

۲۔ شالامار باغ سوہدرہ (واقعہ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ)

۳۔ باؤلی قلعہ دہلی کا شالامار باغ۔

۴۔ شالامار باغ راجوری (قلمرو جموں)

۵۔ جموں کا شالامار باغ۔

۶۔ شالامار باغ کپور تھلہ

۷۔ شالامار باغ واقعہ ریاست پٹیالہ متصل کالکا۔

سوائے باغ ۲ و ۳ و ۷ کے باقی تمام باغات راقم الحروف کے دیکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے ان کے علاوہ کوئی اور باغ بھی کسی اور مقام پر اس نام کا ہو جس کی کیفیت سے یہ ہیچمدان لاعلم ہو۔ اس لئے انہی باغات کے مختصر سے حالات ناظرین اوراق ہذا کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

شالامار باغ کشمیر

ہارون کی جھیل | شہر سری نگر سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک خوشنما فرحت افزا اور روح پرور مقام ہارون[1] کے نام سے واقع ہے۔ اگر خشکی کے رستے اس مقام پر جائیں تو گپکار چشمہ شاہی، نشاط اور شالامار سب اس کے رستے میں آتے ہیں۔ اس مقام پر دوسری صدی بکرمی میں ایک مشہور عابد مرتاض سوکرام سوامی رہتے تھے۔ انہوں نے اس شہر خموشاں میں جس کی خاموشی و بے زبانی میں اسرار قدرت کے ہزارہا نکات و رموز پوشیدہ ہیں اور جس کے سناٹے اور ہو کے عالم پر لاکھوں ہنگامے قربان کئے جا سکتے ہیں۔ یاد الٰہی کے لئے ایک رین بسیرا بنا رکھا تھا۔ راجہ پرورسین[2] اس زمانہ میں کشمیر کا راجہ تھا۔ اُس نے کوہ ماران (ہری پربت) کے دامن میں فتوحات ملکی سے فارغ ہونے کے دس سال بعد سری نگر کے نام سے ایک شہر آباد کیا جو آج بھی اپنی رونق و آبادی اور وسعت میں بڑے بڑے شہروں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ راجہ پرورسین اس مرتاض یوگی کی زیارت کے لئے ہارون کے مقام پر اکثر جایا کرتا تھا۔ یہ مقام نہ صرف اس لحاظ سے کہ یہاں ایک بزرگ و خدا رسیدہ عابد کا مسکن ہے اُسے پسند تھا بلکہ جھیل ہارون کے آئینہ صفت پانی کی لہریں جن کو قدرتی چشمے اور بھی دلآویز بنا رہے تھے۔ یہاں کی سطح ناہموار جگہ خصوصاً بے روک ہوا کے بے باک جھونکے جو بے پئے مست و سرشار کر دیتے ہیں ہارون کی جھیل اس کے گھنے جنگل کا نظارہ، سبزہ زار

[1] اگر شیخ نیاز محمد صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل لاہور کی نظم بعنوان ہارون ملاحظہ کی جائے جو اُنہوں نے ستمبر ۱۹۱۱ء میں بسیر ہارون کے بعد سری نگر میں لکھی ہے تو ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہارون کیسا دلفریب اور کس قدر دلکش مقام ہے۔ اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک چیز عام لوگوں کی نظر میں کیسی معمولی ہے اور ایک شاعر کی نگاہ اس کو کس نظر سے دیکھتی اور اس کی کیفیت سے کس قسم کے دل ہلا دینے والے نتائج پیدا کرتی ہے۔

[2] ایام حکومت ۶۰ سال ۱۵۹ بکرمی لغایت ۲۱۹ بکرمی، مطابق ۱۰۲ء لغایت ۱۶۳ء۔

کی کیفیتیں یہ سب باتیں دامنِ دل کھینچنے کے لئے کافی اثر رکھتی تھیں۔

شالی مالی کی بنا

یہ دلچسپیاں تھیں یہ وجوہات تھیں جن سے متاثر ہو کر راجہ پرورسین نے اپنے لئے وہاں ایک آرامگاہ تعمیر کرائی۔ جسے آجکل کے الفاظ میں ریسٹ ہوس REST HOUSE کہہ سکتے ہیں۔ راجہ کی تقلید میں امراء وزراء نے بھی بنگلے تعمیر کرائے۔ ان کے پرائیویٹ ملازموں کے لئے بھی مکانات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ مکانات ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئے۔ پرورسین نے اپنی شاہی اقامت گاہ کا نام شالی مالی رکھا۔

شالی مالی کی وجہ تسمیہ

اس مقام یا راجہ کی اقامت گاہ کا نام شالی مالی کیوں رکھا گیا۔ شالی مالی کا مطلب کیا ہے۔ اس کے متعلق جو زیادہ قرینِ قیاس وجہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہم اپنے محقق و معتدخ[1] دوست جناب شمیم کاشمیری کے الفاظ ہی میں بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں آپ فرماتے ہیں" اثنائے مطالعہ میں ایک پوران میں جس کا نام اگنی پوران ہے ہمیں ایک پھول کا نام نگاہ سے گذرا جس کا نام "شالی مالی" ہے۔ تخیل نے ہمیں بتایا۔ کہ کسی گلستان کا نام اس پھول سے پڑ سکتا ہے جو کثرت سے اس میں موجود ہو۔ شاید راجہ پرورسین نے اس مقام کا نام اس وجہ سے شالی مالی رکھا ہو۔ کہ شالی مالی پھول جو دیوتاؤں کو چڑھائے جاتے ہیں۔ اس علاقہ میں اُس زمانہ میں زیادہ ہوتے ہوں یا خود راجہ ہی نے ان پھولوں کی افزونیٔ پیداوار کا یہاں خاص انتظام کیا ہو"

کشمیر میں اُس زمانہ میں خالص سنسکرت زبان تھی۔ پوران بھی سنسکرت زبان ہی میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شالی مالی بھی اسی زبان کا لفظ ہے۔

شالی مالی اور اس کی عمارات کی ویرانی

پرورسین کی شصت سالہ حکومت اور رشی سوکرام سوامی کی حیات تک تو شالی مالی میں بڑی رونق رہی۔ اس زمانہ میں آجکل کی طرح خشکی کا رستہ نہیں تھا۔ شالی مالی تک آمد و رفت ان بے پہیہ فٹنوں اور لکڑی کے اُن اُڑن کھٹولوں کے ذریعہ ہوتی تھی جو آبِ ڈل کی سطح پر کشتیوں کے نام سے دوڑتے اور اڑتے پھرتے تھے۔

---

[1] رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب ریٔنہ شمیم ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پنجاب (لاہور) جن کا پایۂ تحقیق بہت بلند ہے۔

راجہ کی وفات (سنہ ۶۲ء) کے بعد انقلاب روزگار نے رفتہ رفتہ شاہی آرامگاہ اور شاہی متوسلین کی سنگین و سربفلک عمارتوں کو بے نام ونشان کر دیا۔ وہ ایوانات جہاں راجے اور وزرا امرا رہتے تھے بوم وچغد کی اقامت گاہ بن گئے۔ البتہ مٹے ہوؤں کی ایک یادگار باقی رہ گئی۔

شالی مالی سے شالی مار کس طرح بنا

راجہ پرورسین کی وفات (سنہ ۶۳ء) سے لیکر ہندو قدیم راجگان کے آخری ایام سنہ ۱۳۲۴ء یا ساڑھے گیارہ سو سال تک بڑے بڑے نامور راجے کشمیر میں گذرے ہیں۔ پھر سنہ ۱۳۲۵ء سے سنہ ۱۵۵۶ء تک کشمیر کے مسلمان بادشاہوں نے بھی کشمیر میں شان وشکوہ کے ساتھ حکومت کی ہے۔ لیکن نہایت تعجب کی بات ہے کہ کسی راجہ اور کسی بادشاہ نے چودہ سو سال کے طویل عرصہ میں شالی مالی کے پُرفضا مقام کی طرف مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ سنہ ۱۵۵۶ء میں جب اقبال اکبری جنت کشمیر کیطرف رُخ کرتا ہے تو اس مقام کا نام پھر کشمیر کی تاریخوں میں نظر سے گذرتا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں اب یہ نام شالی مالی کی جگہ شالی مار مشہور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ سنسکرت کی آغوش میں ایک اور زبان کشمیری پرورش پاکر پروان چڑھتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ سارے ملک پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اسی زبان نے شالی مالی کو شالی مار بنا دیا۔ مار کے معنے کشمیری زبان میں ندی یا نالہ ہیں۔ اور چونکہ ہاروَن کے مقام پر واچھی گام کے دامن میں ایک خوشنما جھیل بھی ہے۔ اس لئے اس کا نام شالی مار بالکل موزون معلوم ہوتا ہے۔

باغ شالی مار اور شہنشاہ اکبر

شہنشاہ اکبر[1] کے زمانہ میں اُس مقام کا نام شالی مار تھا۔ وہ موسم بہار میں اس رُوح افزا مقام پر آیا اور اس کے ملاحظے سے ایسا خوش ہوا کہ اُس کی جدت پسند طبیعت نے مناظر قدرت کی دلفریبیوں کو انسانی

[1] اکبر تین مرتبہ کشمیر میں آیا ہے۔ پہلی بار سنہ ۹۹۷ھ میں دوسری بار سنہ ۹۹۸ھ میں تیسری مرتبہ سنہ ۱۰۰۵ھ میں کشمیر سنہ ۹۹۴ھ ۱۶ ذیقعدہ کو اس نے فتح کیا تھا۔ سنہ ۱۰۱۴ھ کو اکبر نے وفات پائی۔

دماغ کے اختراعات کے اشتراک سے اور زیادہ مزین کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تالاب ہاروَن سے ایک نہر نکالی جائے اور آبِ ڈل کے کنارے پر ایک باغ اسی مقام (شالی مار) کے نام پر احداث کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی چشمہ یعنی تالاب کے وسط سے ایک نہر جس کو جُوئے کلان کہتے تھے جاری کی گئی۔ اور پہاڑ کے دامن میں جہاں ڈل کا پانی ختم ہوتا تھا بلند جگہ پر باغ شالی مار کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لب التواریخ[1] میں لکھا ہے "جُوئے کلان در وسط آں رواں کردہ عمارات عالیہ سنگین و مصفی و حوض سنگیں قریب پنجاہ و پنجاہ پیش و پس عمارت با فوارہ کردہ یمین و یسار جوئے صفہائے خوشنما"۔ پھر یہاں کے ثمردار درختوں اور گل و گلزار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "در زیر آں سبزہ سہ برگہ کہ بغایت نرم و خوشبو دارے باشد درمیانِ گلستان خیابان ہا برائے گلگشت تماشائیاں بستہ در ہر خیابان از دو جانب نہرے نہرے رواں ساختہ الحال بہ سبب عدم پرداخت آں طریق نماندہ لیکن نشانہا باقی است"۔ اس پہاڑی کا تعلق جس کے نشیب میں قریۂ شالیمار اور باغ شالیمار واقع ہے۔ پرگنہ پھاگ کے کوہستان کے ساتھ ہے۔ باغ کی چار دیواری اکبر کے زمانہ ہی میں بنائی گئی تھی۔

شالی مار میں جہانگیر کا باغ فرح بخش

جہانگیر زمانہ شاہزادگی میں تو بارہا کشمیر میں آیا ہے لیکن شہنشاہِ ہندوستان کی حیثیت سے وہ سب سے پہلی مرتبہ ۵ رشوال ۱۰۲۸ھ کو آگرہ سے روانہ ہوا۔ اور متھرا۔ دہلی۔ لاہور اور دیگر بڑے بڑے شہروں کی سیر کرتا ۱۵ ربیع الاول ۱۰۲۹ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۶۲۰ء کو یعنی کامل ۵½ ماہ کے بعد خطۂ کشمیر جنت نظیر میں پہنچا۔ حرم سرائے اور شہزادے ساتھ تھے۔ شاہانہ طرز پر باغات و عمارات کی تعمیرات کا اہتمام ہونے لگا۔ شہزادہ خرم جو بعد میں شاہجہان ہو کر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا اپنے شوق طبعی کی وجہ سے اس جدید محکمہ کا مہتمم اعلیٰ قرار پایا۔

---

[1] یہ تواریخ اخوند ملا بہاؤالدین نقشبندی خوشنویس کاشمیری کی تصنیف ہے۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ملا بہاؤالدین نے مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانہ میں وفات پائی ہے۔

جہانگیر نے قریۂ شالیمار میں اپنے والد شہنشاہِ اکبر کی قائم کی ہوئی بنیادوں کو وسعت دی۔ اور شاہجہان نے اس میں نہایت رفعت و شوکت اور زیب و زینت کے ساتھ جا بجا عمارات تعمیر کرائیں۔ اس زمانہ میں دلاور خاں جس کی یادگار سری نگر میں اب بھی باغ دلاور خاں کے نام سے مشہور ہے کشمیر کا گورنر[1] تھا۔ شہنشاہ نے باغ کا نام "فرح بخش" تجویز کیا۔ مرزا محمد سلیم ایک درباری شاعر نے باغ کے تیار ہو جانے پر باغ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس کے شروع کے اشعار خصوصاً شعر (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ کی تعمیر سے پہلے اس مقام کا نام شالی مار ہی تھا۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں:

شنیدم شاہ روشندل جہانگیر
زعشرت شد چو رونق بخش کشمیر

چو شد روان دریا جلوہ گاہش
بسوئے شالی مار افتاد راہش

فضائے دید چوں روئے عروساں
سزاوارِ عمارات و گلستاں

بطبعش روح روح افزا اثر کرد
گراں خوابی دماغش را خبر کرد

چو شد آراستہ باغ فرح بخش
بحکمِ حضرتِ ظلِ الٰہی

شہنشاہِ شہاں شاہِ جہانگیر
کہ مشہور است از ماہ تا بماہی

پئے تاریخ ایں گلزار ریحانی
خرد فرمود "فرحت گاہِ شاہی"

اگر یہ فرض کر لیا جائے۔ کہ "فرحت گاہ شاہی" کا قطعہ تاریخ ذوالحجہ ۱۰۳۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ تو اس حساب سے یہ باغ دو سال دس ماہ کے عرصہ میں تیار ہوا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جہانگیر وسط ربیع الاول ۱۰۲۹ھ میں کشمیر میں آیا ہے۔ اور اسی

---

[1] دلاور خاں ۱۶۱۸ء لغایت ۱۶۲۰ء مطابق ۱۰۲۷ھ لغایت ۱۰۲۹ھ تک کشمیر کا گورنر رہا ہے۔ جہانگیر کشمیر سے واپسی کے وقت اس کو ساتھ ہی لے گیا تھا۔

[2] اس زمانہ (۱۰۳۱ھ) میں کشمیر کا گورنر اعتقاد خاں تھا۔ جو ۱۰۳۱ھ سے ۱۰۴۳ھ تک کشمیر میں رہا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اس سے زیادہ طویل حکومت اور کسی گورنر نے یہاں نہیں کی۔

مہینے کے اندر اس نے فرح بخش کی تعمیر کا حکم دیا ہے

شالامار باغ شاہجہان کے زمانہ میں | شاہجہان کو باغات و عمارات کا شوق باپ سے بھی زیادہ تھا۔ اکبرآباد۔ دہلی۔ لاہور۔ کشمیر اور ہندوستان کے بعض دیگر مشہور مقامات اب بھی تعمیرات شاہجہانی کی شہادتیں دے رہے ہیں۔ اس نے اپنے زمانہ میں باغ فرح بخش کو اور بھی وسعت دی۔ گل و گلزار۔ درختان ثمردار۔ فوارے۔ حوض۔ بارہ دری اور دیگر عمارات سے اس کو چار چاند لگا دیئے ؎

احسن اللہ احسن جس کو بادشاہ نے اسکی شجاعت و بسالت کی وجہ سے ظفر خاں[1] کا خطاب دیا تھا۔ ان دنوں کشمیر کا گورنر تھا۔ وہ خود مناظر فطرت اور قدرت کی گلکاریوں کا عاشق تھا۔ اور باغات و عمارات کی تعمیر میں شاہانہ دماغ رکھتا تھا۔ چنانچہ کشمیر میں اس نے چار باغ بنوائے اور اپنی مشہور مثنوی میں ان کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے ظفر خاں کو فیض باغ کی تیاری اور فرح بخش کی آرائش کا حکم دیا جس کا ذکر وہ اپنی مثنوی میں بھی ذیل کے الفاظ میں لکھتا ہے :-

ظفر خاں کردہ از تعلیم حضرت ز فرط دانش و ادراک و فطرت
دو گلشن را بہم زانگونہ پیوند کہ نتواں شاں جدا کردن بہ سوگند
در آوردہ چنیں رضواں سرشتے بہشتے را در آغوش بہشتے
فرح بخش آں سرِ ہر باغ و بستاں فرح بخش و باغ حور رضواں
بزیر پایش از دل مے نہد سیم بفرق از فیض بخش زیبد و بیم
ہمیشہ تازہ است آں باغ دلخواہ شگفتہ چوں گل بخت شہنشاہ

خصالی شاعر نے باغ فیض بخش کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جس کے اخیر شعر سے سال تعمیر ۱۰۴۲ھ نکلتا ہے۔ اس کے کچھ شعر ذیل میں درج ہیں ؎

چو باغ فیض بخش از حکم شاہی ابر باغ ارم گشتہ سپاہی
فرح بخش از کمال افتخارش چو گل بر طرف خود دادہ قرارش

[1] ظفر خاں خواجہ ابوالحسن کا بیٹا تھا۔ شاہجہان نے دراصل ابوالحسن (باقی بر صفحہ ۵۸)

ازیں رو کاشمر فخر جہاں است | کہ در وے گلشن شاہ جہان است

پئے تاریخ سالش صبح گاہی | خرد گفتا "مسرت بخش شاہی"

شالی مار سے شالا مار

جہانگیر کے زمانہ تک شالامار کو شالیمار ہی کہتے تھے۔ جیسا کہ مرزا محمد سلیم کے شعر ~ چو شد داماں دریا جلوہ گاہش ۔ بسوئے شالی مار افتاد راہش سے واضح ہوتا ہے۔ لیکن شاہجہان کے زمانہ میں شالی مار کی جگہ شالا مار نام زبانزد عوام ہو چکا تھا۔ چنانچہ ظفر خاں احسن اپنی مثنوی میں لکھتا ہے ~

بوصفِ شالامار آں خلد ثانی | ہزاراں گوشہ در گوہر فشانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴) ہی کو گورنر کشمیر مقرر کیا تھا لیکن اُس نے اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے نظامت کشمیر پر اپنے قابل و لائق بیٹے احسن اللہ کو مقرر کرا دیا۔ احسن اللہ شاعر تھا۔ صائب اور غنی کے ساتھ اس کی بزم آرائیاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ شعراء کا قدر دان بھی تھا۔ اور انعام و اکرام کے ذریعہ داد سخن دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ یہ کشمیر میں سنہ ۱۰۴۲ھ سے سنہ ۱۰۵۰ھ اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۰۵۲ھ سے سنہ ۱۰۵۶ھ تک رہا ہے۔ سنہ ۱۰۴۶ھ میں اس نے بادشاہ کے حکم سے تبت کو فتح کیا اور ظفر خاں کا خطاب حاصل کیا۔

اس کی مثنویاں ہفت منزل اور بے نظیر بہت مشہور ہیں۔ آخر الذکر راقم کے کتب خانہ میں بھی ہے۔ اس نے اپنی مثنویوں میں لاہور۔ اکبر آباد۔ کابل اور کشمیر کی بہت تعریف کی ہے کشمیر سے تو عشق حقیقی رکھتا تھا۔ لکھتا ہے ~

الٰہی تا بود کشمیر آباد | ز گلزار جنانم بدہ یاد

بہر کس آنچہ خواہد بے سخن دہ | مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

لاہور کے متعلق لکھتا ہے ~

ز بعد اکبر آباد است لاہور | کہ در خوبی بعالم گشتہ مشہور

برون آرد ہوایش از فراقت | دہد یاد از خراسان و عراقت

بکام دل چو احسن ناتوانی | بباغ کامراں کن کامرانی

آج باغ کامران کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ البتہ بارہ دری کامران (بقیہ بر صفحہ ۵۶)

فرح بخشش شہنشہ نام کردہ — فرح زاں باغ جنت وام کردہ

پھر ایک جگہ لکھتا ہے ؎

فلک زینگونہ کردہ تیز رخشش — کہ تا آید بطوف فیض بخشش
بہ آوردہ پُر از شوقِ نگارشش — کہ تا بوسد کنارِ شالہ مارشش

پھر شالامار کی تعریف میں بے خود ہو کر کہتا ہے ؎

نسیم از رنگِ گلہائش اغوانی — نزاکت کردہ بر شاخش گرانی
بروئے سبزہ شبنم گشتہ سیار — چو عکسِ گوشوارہ از خطِ یار
گلش دستِ صبا را رنگ کردہ — کہ بو بہ رنگِ حنا را تنگ کردہ
سر زلفِ نہالِ او بہ منت — نگہ دارد دلِ مرغانِ جنت

شالامار میں شاہی عمارتوں سے کیا کچھ رونق تھی۔ اس کی کچھ کیفیت اب بھی شالامار کشمیر کی عمارات سے معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر ظفر خاں جو اُس زمانہ کا چشم دید گواہ ہے دیکھئے کن پُر شکوہ الفاظ میں صنادید عجم کے نقش و نگار کا پتہ بتاتا ہے ؎

عمارتش بہ نوعے دل نشین است — کہ گوئی خاتم جم را نگین است
بہ سقفش نقش بستہ اسم اعظم — نہ خاتم بند نقشش چوں نقش خاتم
ندیدہ عکس در دل ربائے — عمارتہائے بہ ایں محکم بنائے
عمارتہائے بہ ایں خوبی کہ دیدہ — ز سنگ و چوب مصنوعی کہ دیدہ
ز شوقِ دیدن آں سقف و دیوار — دراں ثابت کواکب گشتہ سیار
ہوائے او چناں از نشہ سیراب — کہ ساقی نیست محتاج مئے ناب
بہ کیفیت چناں سقف و بنائش — کہ پُر مے میشود جام از ہوائش
ز خوبی ماہ تا ماہی درو ہست — چو جنت ہر چہ مے خواہی درو ہست
بہ ایں خوبی سپہرے بر زمیں نیست — شبستانے چنیں در ہند و چیں نیست

(بقیہ صفحہ ۵۵) کی سخت جانی زاوی کے کنارہ پر دریا کی موجوں کے تھپیڑوں کا سالہا سال سے مقابلہ کر رہی ہے۔ اور گو انجام معلوم ہے لیکن صرف اتنا کہہ رہا ہے ع مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا ✣

شالامار باغ عالمگیر کے زمانہ میں جہانگیر اور شاہجہان تو کئی مرتبہ کشمیر آئے ہیں۔ مگر عالمگیر صرف ایک ہی مرتبہ اس جنت نظیر ملک میں آیا ہے اور واپس گیا ہے تو اس خیال کے ساتھ کہ "بدوں ضروری امور ملکی کے سرزمین کشمیر میں صرف سیر و شکار کے لیئے بادشاہوں کا آنا رائے صائب کے خلاف ہے" اور اس رائے کے قائم کرنے کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ وہاں سفر میں کئی آدمی اور گھوڑے اور دیگر جانور ہو گئے۔ بلکہ ایک ہاتھی بھی پہاڑوں کے نشیب و فراز کی نذر ہو گیا ۔

غرض بادشاہ ذی قعدہ سنہ ۱۰۷۵ھ میں بعہد اسلام خان گورنر کشمیر میں آیا۔ فوج لشکر حرم سرا ساتھ تھے۔ فرح بخش اور فیض بخش کی عالیشان عمارتوں میں پھر رونق نظر آنے لگی۔ بادشاہ نے عید کا جشن بھی اسی باغ میں منایا۔ اور آخر صفر کو تین ماہ کے قیام کے بعد واپس لاہور آ گیا ۔

بادشاہ کے ساتھ ڈاکٹر برنیر مشہور سیاح بھی تھا جس نے اپنے سفرنامہ میں اس باغ کے نہایت دلچسپ حالات لکھے ہیں ۔

افغانوں کا دور مغل شہنشاہوں کا عروج عالمگیر کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی مغل بادشاہ کشمیر کیا لاہور[۱] تک بھی نہیں آسکا۔ زوال سلطنت کے بعد پنجاب کشمیر اور کابل کے صوبے درانیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ جن میں پنجاب تو ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ نے لے لیا۔ اور کشمیر اور کابل پر افغانوں ہی کا قبضہ رہا۔ ۱۸۱۹ء میں کشمیر بھی افغانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ۔

محمود شاہ و شجاع الملک درانی کے عہد میں سردار محمد عظیم خان ۱۸۱۲ء سے ۱۸۱۹ء تک کشمیر کا گورنر رہا ہے۔ سردار مذکور شالامار کے دونوں حصوں فیض بخش اور فرح بخش میں داد عشرت دیتا رہا ہے۔ اس نے باغات کی مرمت بھی کرائی۔ اور حتی الامکان اسکی آرائش

---

[۱] صرف عالمگیر کا بیٹا شاہ عالم بہادر شاہ اول لاہور تک آیا ہے۔ بلکہ اس نے وفات بھی لاہور ہی میں پائی ہے اس کے بعد محمد شاہ رنگیلے کا بیٹا احمد شاہ بہ ایام شہزادگی احمد شاہ درانی کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے صرف سرہند تک آیا ہے۔ اور احمد شاہ کو لاہور میں بھگا کر آپ واپس دہلی چلا گیا ہے یہ آخری فتح تھی جو اکبر کے جانشینوں کو حاصل ہوئی تھی ۔

وزیبائش اور رونق اور خوبصورتی کو کم نہ ہونے دیا۔

سکھوں کے عہد میں شالا مار

سکھوں کے زمانہ میں جہاں پنجاب کی اسلامی عمارات پر زوال آیا۔ کشمیر کی اسلامی عمارتیں بھی ان کے مذہبی تعصب سے نہ بچ سکیں۔ دیوان کرپا رام جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ کا چھٹا گورنر کشمیر تھا کے عہد (۱۸۲۷ء لغایت ۱۸۳۱ء) میں شالا مار باغ کی حالت بہت ردی تھی۔ حالانکہ اس سے تیرہ چودہ سال پیشتر ہی افغانی دور میں اس کی مرمت از سر نو ہو چکی تھی۔ دیوان چونکہ باغات و اختراعات کا بڑا شوقین اور نہایت زندہ دل بلکہ عیش پرست امیر تھا۔ اس لئے اس نے تین ہزار روپیہ شالمار کی مرمت کے لئے خزانہ سے منظور کئے۔ مگر مرمت کا کام ایسے نااہلوں کے ہاتھ میں رہا کہ یہ کام سرانجام نہ ہو سکا۔

شالا مار اور ڈوگرہ حکومت

۱۸۴۶ء میں کشمیر کے تخت و بخت کے ساتھ ہی شالا مار کشمیر کی قسمت بھی ڈوگرہ خاندان کے قبضہ میں آ گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ آنجہانی کے ایام حکومت (۱۹۱۴ب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۲ب ۱۸۸۵ء) میں وزیر پنوں کشمیر کا گورنر تھا۔ اس نے ۱۹۱۸بکرمی میں نشاط باغ وغیرہ کے علاوہ مہاراجہ کے حکم سے شالمار کی مرمت بھی شروع کی۔ مگر نگران کاروں کی بددیانتی کے باعث مرمت کی بجائے باغ کو دانستہ برباد و تباہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ محمد خلیل مرجانپوری نے اپنی کتاب تاریخ خلیل میں لکھا ہے کہ "نو دانہائے نخاس از میاں کشیدہ بردند بجائے آں نو دانہائے سفالین جسپانیدند۔ نگین ہائے عقیق وغیرہ بمقدار دو خروار زر بقبضہ آوردند۔ ایں ہمہ بموجب خورد و برد اہل کاراں شد"۔

موجودہ حکمران کشمیر مہاراجہ پرتاب سنگھ کی طرف سے جن کے عہد حکومت کو ۱۹۲۴ء میں ۱۸۸۵ء کی تخت نشینی کے مطابق چالیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ شالا مار باغ کی کئی مرتبہ مرمت ہو چکی ہے۔ خصوصاً جب کبھی وسیرایان ہند کشمیر میں بغرض سیر و سیاحت آتے ہیں۔ یا مہارانی صاحبہ خود مہاراجہ صاحب یا سر راجہ ہری سنگھ کوئی پارٹی شالہ مار باغ میں دینا چاہتے ہیں تو اس کی درستی۔ مرمت۔ صفائی اور تراش خراش کا کام اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں سر راجہ ہری سنگھ (ولی عہد) کی سالگرہ کی تقریب پر شالا مار میں ایک پارٹی اعلیٰ پیمانہ پر دی گئی تھی

جس میں ہز ہائی نس تمام امراء، وزراء، صاحب ریذیڈنٹ اور انگریز معہ لیڈیوں کے جمع تھے۔ اور ۷ ؍ اکتوبر کو وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی دعوت شاہی اور ۱۴ ؍ اکتوبر کو مہارانی صاحبہ اور لیڈی ریڈنگ کی زنانہ ٹی پارٹی کے موقعہ پر باغ کا جوبن قدرتی نظاروں اور انسانی دستکاریوں کی نمود و نمائش کی وجہ سے پھٹا پڑتا تھا ٭

شالامار باغ سوہدرہ

سوہدرہ بہت پرانا قصبہ ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ محمود غزنوی کے غلام ایاز کا آباد کیا ہوا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں یہ پرگنہ سیالکوٹ کے ماتحت تھا۔ اور نہایت آباد و بارونق تھا۔ اب ضلع گوجرانوالہ میں تحصیل وزیر آباد کے ماتحت ہے ٭

خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے کہ امیر الامراء نواب علی مردان خان کو شاہجہان نے جب پنجاب کی نظامت سپرد کی۔ تو اُس نے سوہدرہ کا نام اپنے بیٹے کے نام پر ابراہیم آباد رکھا۔ اور اس کو عالیشان ایوانات سے دار الخلافہ (لاہور) کا ہم پلہ بنا دیا۔ ایک بے نظیر باغ تعمیر کرایا جس کا صحیح نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن سوہدرہ کا باغ چونکہ باغ لاہور کے نمونہ پر تھا۔ اسی طرح مختلف طبقے۔ فوارے۔ نہریں حوض آبشاریں اس کے اندر تھیں اس لئے وہ شالامار باغ ہی کے نام سے موسوم ہو گیا ٭

شالامار لاہور ۱۰۵۲ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے۔ اور ۱۰۶۷ھ میں نواب علیمردان خان کا لاہور ہی میں انتقال ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوہدرہ کا باغ جس کی متعلق صاحب خلاصۃ التواریخ[1] لکھتے ہیں "دم مساوات بہ باغ شالامارے زند" ۱۰۵۲ھ سے ۱۰۶۷ھ کے درمیان ہی تعمیر ہوا ہے ٭

---

[1] صفحہ ۹۴، مطبوعہ ۱۹۱۸ء، سال تصنیف ۱۱۱۸ھ عہد عالمگیری۔ یہ تاریخ بہت نایاب تھی۔ مگر ۱۹۱۸ء میں طبع ہو کر عام ہو چکی ہے ٭

باغ لاہور کی تعمیر پر چھ لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی۔ باغ سوہدرہ کی لاگت بھی اس سے کم نہ تھی۔ تاریخ مذکور میں لکھا ہے: "شش لکسا روپیہ بر اں عمارت عالیہ و باغ و نہرے کہ از دریائے توہی برائے باغ آوردہ صرف شدہ و دو دیہے از دیہات سودہرہ از سرکار بادشاہی برائے مرمت باغ و شہر مذکور بطریق انعام التمغا بنام امیر الامراء مقرر است"

جس باغ پر اُس زمانہ میں جبکہ معمار و مزدور کی اُجرت تین چار آنہ سے زیادہ نہ تھی اور جس کے لئے طول طویل فاصلہ سے نہر جاری کی گئی ہو۔ جس کے اندر عالیشان و رفیع درجات عمارتیں تعمیر ہوئی ہوں۔ اور جن کی شکست ریخت اور مرمت کے لئے حکومت کی طرف سے بعض دیہات معاف ہوں۔ وہ باغ کس شان و شکوہ اور کس جاہ و جلال کا ہوگا۔

ابراہیم خاں جس کے نام پر علی مردان خاں نے سودہرہ کا نام ابراہیم آباد رکھا بعہد عالمگیری ۱۰۷۲ھ میں پہلی مرتبہ کشمیر کا گورنر مقرر ہوا۔ اسی کے عہد میں عالمگیر تین ماہ تک کشمیر میں رہا ہے۔ دوسری مرتبہ ابراہیم خان کو ۱۰۸۹ھ میں پھر کشمیر کی نظامت پر بھیجا گیا۔ جہاں وہ ۱۰۹۶ھ تک رہا۔ تیسری مرتبہ ۱۱۱۳ھ سے ۱۱۱۷ھ تک کشمیر کا صوبہ رہا۔ چوتھی بار یعنی آخری مرتبہ وہ ۱۱۲۱ھ میں پھر کشمیر آیا۔ اسی سال عالمگیر نے اس کو نواب علی مردان خان ثانی کا خطاب دیا۔ لیکن ابراہیم ضعیف ہو چکا تھا۔ تین ماہ کے بعد اس نے کشمیر ہی میں انتقال کیا۔

اس کی زندگی (۱۱۲۱ھ) تک باغ اپنے پورے شباب پر تھا چنانچہ ۱۱۱۸ھ کا مصنف (صاحب خلاصۃ التواریخ) باغ سوہدرہ کی تعریف میں اکثر مقامات پر رطب اللسان نظر آتا ہے۔ لیکن آج سوا دو سو سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں۔ تو کھنڈرات اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان سے صرف اس قدر بتا سکتے ہیں

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ۔۔۔ کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

سوہدرہ میں اس علاقہ کا نام جہاں یہ باغ تھا۔ نولکھا باغ مشہور ہے۔ اور کہا

جاتا ہے کہ یہ باغ نو لاکھ روپیہ کی لاگت سے بنا تھا۔ لیکن خلاصۃ التواریخ کا مصنف جس نے خود وہ باغ دیکھا ہے۔ نہ اس نام (نولکھا) کی تصدیق کرتا ہے اور نہ اس لاگت (نو لاکھ) کی۔ باغ کی زمین کچھ ہندوؤں کے قبضے میں ہے کچھ مسلمان زمینداروں کے پاس ہے۔ باغ کی عمارتوں بلکہ چاردیواری اور بنیادوں تک کی اینٹوں سے لوگوں نے اپنے اپنے مکانات بنا لئے۔ اور کیوں نہ بنتے ؎

آخر گل اپنی صرف در میکدہ ہوئی پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

باغ شالمار باؤلی قلعۂ دہلی

شاہجہان کا چوبیسواں سال جلوس تھا کہ ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں اُس کے اکبر آبادی محل نے قلعہ شاہجہان آباد سے اڑھائی کوس کے فاصلہ پر باؤلی کے قریب ایک عالیشان باغ لاہور اور کشمیر کے سرکاری باغات کے نمونوں پر تعمیر کرایا جس کے طبقوں اور تختوں کے نام بھی انہی کے ناموں پر فرح بخش اور فیض بخش رکھے گئے اس باغ کے اندر لاہور کی طرح خوشنما عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ نہر نہ صرف باغ کو سیراب کرتی تھی۔ بلکہ تمام عمارتوں کے نیچے دو گز چوڑی بہتی تھی۔ یہ چوڑائی باغ کے عین وسط میں آٹھ گز ہو جاتی تھی۔ یہ باغ اور اس کی عمارتیں تین چار سال کے عرصہ میں دو لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہوئیں[۱]

باؤلی میں ایک سرائے بھی تھی جو پہلے خام تھی۔ مگر جب باغ کی تعمیرات شروع ہوئیں۔ تو اس کے ایوان اور حجرے جو تعداد میں ستر تھے۔ ریختہ کے بنوا دیئے گئے

---

[۱] ظفر نامہ شاہجہان صفحہ ۲۲۷ ایڈیشن اول

شالامار باغ راجوری (قلمرو جموںؒ)

کشمیر اور لاہور کے شالامار باغ کی شہرت ہندوستان کے ہر حصہ میں پہونچ رہی تھی اُس زمانہ کے شوقین رؤسا نے بھی اس نمونہ پر باغات تعمیر کرائے۔ ان میں ایک باغ راجہ عنایت اللہ خاں نے اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائی عہد میں اپنے دارالخلافہ راجوری میں تعمیر کرایا۔ اُس زمانہ میں راجوری کا نام راجور تھا۔

راجہ عنایت اللہ خاں ۱۰۵۸ھ میں بعہدِ شاہجہان تخت نشین ہوا۔ دربار میں اس کی بڑی عزت تھی۔ پنج ہزاری منصب رکھتا تھا۔ اور اس کے معاوضہ میں پنجاب سے کشمیر تک کے رستہ کی حفاظت کے فرائض اس کے ذمہ تھے۔ مرزا رفیع اللہ خاں اس کے بیٹے نے راجہ دھرپ دیو پر جموں میں فتح پائی تھی۔ اور بطور یادگار منڈی یعنی شاہی محلات کی چند اینٹیں اُکھڑ کر اپنے ہمراہ راجور میں لے آیا تھا۔

راجہ عنایت اللہ خاں نے عالمگیر اور دارا کی لڑائیوں میں ہمیشہ اول الذکر کا ساتھ دیا۔ اس لئے جب عالمگیر بادشاہ ہوا۔ تو اُس نے خلعت بے بہا ہفت زنجیر فیل اور کئی گھوڑوں اور قیمتی اسباب کے علاوہ پونچھ۔ سابلہ۔ مناور۔ کری کرہ یالی۔ بھمبر۔ چھبال کے علاقے بطور جاگیر عطا فرمائے۔

۱۰۶۸ھ کے بعد جب ریاست راجور ایک مملکت ہو گئی۔ تو راجہ عنایت اللہ خان نے خاص شہر میں کچہری محلّی۔ حمام اور جامع مسجد کی عالیشان عمارتیں اور مختلف مقامات میں قلعہ جات بنوانے کے علاوہ دریا کے پار شالامار باغ کے نام پر ایک باغ تیار کرایا۔ اس میں ایک خوشنما بارہ دری بنوائی۔ باغ کی ایک طرف کی دیواریں دریا کے پانی سے ٹکراتی تھیں۔ چاردیواری باغ کی بڑی مضبوط تھی۔ اور چاردیواری کے اندر علاوہ بارہ دری کے اور بھی کئی مکانات تھے۔

؎ وفات بعہدِ عالمگیر ۱۰۸۲ھ

شالامار اور دیگر عمارات کی تکمیل کے بعد اس باغ میں اعلیٰ پیمانہ پر چراغاں اور روشنی کا انتظام کیا گیا۔ روشنی کی شعاعیں جب دریا کے بہتے ہوئے پانی پر اپنا عکس ڈالتی تھیں تو اُن کی لرزتی اور کانپتی ہوئی ترچھی لکیریں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ اس عظیم الشان جلسہ میں جو اس کوہستان میں اپنی قسم کا پہلا جلسہ تھا۔ رعایا کو دعوت عام دی گئی۔ کاریگروں اور میر عمارات اور منتظموں کو انعامات اور خلعت تقسیم کئے گئے۔

راقم الحروف نے بھی یہ باغ ۱۹۰۳ء میں گجرات اور بھمبر کے رستے کشمیر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ بارہ دری موجود ہے جس سے اب ڈاک بنگلہ کا کام لیا جاتا ہے۔ اور اس کی مرمت وغیرہ ہوتی رہتی ہے۔ چار دیواری کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ صرف وہ دیوار موجود ہے۔ جس کے ساتھ موسم برسات میں دریا زور شور کے ساتھ بہتا ہے۔
۱۸۴۶ء میں راجہ گلاب سنگھ والئی جموں کو اس کی ظاہری و باطنی خدمات کے صلہ اور انگریزوں کو ایک کروڑ روپیہ دینے کے معاوضہ میں مہاراجہ کا خطاب اور کشمیر اور کوہستانِ ہزارہ کا علاقہ دیا گیا۔ چنانچہ اسی بناء پر اس نے ۲۲ رمئی ۱۸۴۶ء کو ریاست راجور پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانہ میں راجہ رحیم اللہ خاں وہاں با اختیار رئیس تھا۔
وزیر آباد میں راجگانِ راجور کی جو شاخ مقیم ہے۔ وہ راجہ رحیم اللہ خاں کے بیٹے راجہ فقیر اللہ خاں کی اولاد سے ہے۔ اس شاخ کے سرکردہ اس وقت راجہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ہیں۔ جو نہ صرف اپنے شہر اور ضلع کے بلکہ صوبۂ پنجاب کے نامور رئیس ہیں۔ اور پنجاب کونسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

شالامار باغ جموں

موجودہ ملک معظم جارج پنجم کے والد ماجد ایڈورڈ ہفتم آنجہانی شاہ انگلستان و شہنشاہ ہندوستان جب اپنی والدہ ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی زندگی میں بعالم شہزادگی ۱۸۷۵ء مطابق سمت ۱۹۳۲ب میں سیاحت ہند کے دوران میں جموں تشریف لائے تھے۔ تو مہاراجہ رنبیر سنگھ والیٔ جموں و کشمیر نے ان کی یادگار میں بمقام جموں عجائب گھر اور یہ باغ شالامار باغ کے نام سے تعمیر کیا تھا۔ یہ دونوں عمارتیں سمت ۱۹۳۳ب میں مکمل ہو گئی تھیں۔ جہاں باغ واقعہ ہے۔ وہاں جنگل تھا اور جگہ نہایت نشیب و فراز تھی۔ چبوترہ کسٹم سے منڈی (شاہی محلات) کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ شالامار باغ نظر آتا ہے۔ باغ کے دروازے کے آگے بہت سی فراخ جگہ تھی۔ جہاں انجمن اسلامیہ اور آریہ سماج کے سالانہ جلسے بڑے بارونق ہوتے تھے۔ اور عیدین کا میلہ بھی لگتا تھا۔ مگر ۱۹۲۱ء میں یہ سفید جگہ دیوان بشن داس سابق چیف منسٹر نے اپنے عروج کے ایام میں حاصل کر لی۔ اور یہاں مکانات تعمیر کر لئے۔ اب باغ بالکل بے رونق ہو گیا ہے۔ باغ کا کل رقبہ تیس بیگھ کے قریب ہے۔ بیس ہزار روپیہ اس پر لاگت آئی تھی۔ اس کی چار دیواری گول پتھروں سے غیر معمولی طریق پر بنائی گئی ہے۔ باغ کے اندر کچھ مکانات بھی ہیں۔ درخت ثمردار ہیں۔ جن میں پیوندی آم خصوصاً قابل تعریف ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ جو باغ کے بانی تھے وہ اکثر اس باغ میں آمدورفت رکھتے تھے۔ مگر موجودہ والیٔ ریاست مہاراجہ پرتاپ سنگھ سالہا سال سے اس باغ میں نہیں آئے۔ اور اب تو دیوان صاحب کے مکانات نے باغ کی رہی سہی رونق پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔ اس لئے باغ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

شالامار باغ کپورتھلہ

راجہ فتح سنگھ والئے کپورتھلہ نے ۱۸۱۷ء میں کپورتھلہ کے گوشۂ شمال مغرب میں تفریح طبع اور کپورتھلہ کی رونق و زیبائش کے لئے یہ باغ تعمیر کرایا۔ باغ سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک ندی جس کو نالہ بائین کہتے ہیں جاری ہے۔ اس ندی سے ایک نہر نکالی گئی ہے۔ جو شالامار باغ کے پیچھے غرب کی طرف بہتی ہوئی پھر بائین میں جاملتی ہے۔ اس باغ میں راجہ فتح سنگھ نے گو لاہور کے شالامار باغ کیطرح جلدتھے تو قائم نہیں کئے۔ لیکن باغ کے اندر عمارات عمدہ تیار کرائیں۔ جن سے باغ کی رونق دوبالا ہو گئی۔ باغ کی بیرونی فصیل یعنی چاردیواری نہایت پختہ اور شاندار بنی ہوئی ہے۔ باغ کے دو دروازے ہیں۔ ایک جنوب کی طرف برلب سڑک۔ دوسرا شمال کیطرف۔ باغ کے اندر ایک عظیم الشان چاہ ہے جس کو آسمانی کنواں کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کنوئیں ہیں۔ اور واٹر ورکس انجن بھی ہے +

بارہ دری کی عمارت قابل دید اور دلکش ہے۔ باغ کے اندر ایک پرائمری سکول اور ایک سرکاری لائبریری ہے۔ باغ چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ جگہ جگہ آرام کے لئے بنچیں رکھی ہوئی ہیں ہری ہری گھاس سے باغ کی کیفیت دلوں پر خاص اثر کرتی ہے۔ سنگ مرمر کا ایک خوبصورت تالاب بھی اس باغ میں ہے۔ لیکن اب وہ عرصہ سے بند ہے۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی خوبصورت سمادھ کے اعلےٰ قسم کے سرخ پتھروں کی وجہ سے بھی باغ میں رونق رہتی ہے +

بسنت کا میلہ کپورتھلہ میں اسی باغ میں ہوتا ہے۔ طوائف۔ نقال۔ قوال گانے والے اور مختلف قسم کے دوکاندار اور شوقین لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اور والئی ریاست کی طرف سے مستوفین کو انعام و اکرام ملتا ہے +

باغ میں گلگتا۔ میٹھا۔ انار۔ آم۔ جامن۔ کیلا۔ امرود وغیرہ کے بے شمار درخت خوبصورت

اور صافت روشوں کے اندر موجود ہیں۔

موجودہ والئی ریاست مہاراجہ جگت جیت سنگھ بہادر باغ کی سیر کو اکثر تشریف لایا کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود باغ کی رونق میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔

جب فروری ۱۹۲۳ء میں مہاراجہ صاحب کی دختر مہاراجکماری امرت کور صاحبہ کی شادی راجہ جوگندر سین والئی ریاست منڈی کے ساتھ ہوئی۔ تو ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو شالامار باغ میں ایک عظیم میلہ منعقد کیا گیا۔ کہتے ہیں شالامار باغ کیا کمپو تھا۔ ہیں ایسا اژدہام پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مہاراجہ صاحب ٹکہ صاحب مہاراجکمار صاحبان راجہ صاحب منڈی کے علاوہ وزیر اعظم دیوان عبدالحمید۔ جملہ اہلکاران ادنےٰ و اعلےٰ معززین ریاست اور زمیداران علاقہ سب آئے تھے۔ رقص و سرود کے جلسوں اور دیگر قسم کے تماشوں سے وہ رونق تھی کہ کھوے سے کھوا اچھلتا تھا۔ اور باغ میں کہیں پاؤں رکھنے کو جگہ نہ تھی۔

باغ کے ساتھ جہاں ایک لیچس اور شہتوت کے درختوں کا ذخیرہ ہے وہاں پہلے دلدل تھی۔ سات سال ہوئے مہاراجہ جگت جیت سنگھ نے یہاں ذخیرہ لگایا جو قریباً ڈیڑھ میل رقبہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ راجہ فتح سنگھ کے زمانہ میں باغ میں مثمن برج تھا۔ جہاں ہر وقت پہرہ رہتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا وہ ہشت پہلو برج گرا دیا گیا ہے۔

شالامار باغ کالکا

کالکا شملہ ریلوے پر کالکا ریلوے سٹیشن کے متعلق یہ باغ ریاست پٹیالہ کے علاقہ میں واقع ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ باغ بہت پرانا ہے اور بادشاہی زمانہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا رقبہ لاہور کے شالامار باغ کے برابر ہے۔ اور اسکے طبقے

اور تختے بھی اسی طرح ہیں۔ جس طرح لاہور شالامار باغ کے ہیں۔ باغ کے اندر ریاست پٹیالہ کے سرکاری مکانات بھی ہیں۔ جن میں ریاست کے ملازم بود و باش رکھتے ہیں۔ ٭ ایک باغ شجاع آباد ضلع ملتان میں بھی شاہ بہار لگا آباد کیا ہوا بتایا جاتا ہے

کوہستانِ کشتوار کا نالہ شالامار

ہندوستان پنجاب اور کشمیر کے باغات شالامار کا ذکر کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس "شالامار" کی کچھ کیفیت بھی بتا دی جائے۔ جس کے ساتھ باغ کے لفظ کی بجائے ندی کا لفظ مشہور چلا آتا ہے ٭

میں سنہ ۱۹۲۶ء میں ضلع اودہم پور (قلمرو جموں) کے بعض پُر فضا مقامات کی سیر و سیاحت میں تھا۔ ایک مقام پر مجھے ایک ندی کا نام شالامار بتایا گیا۔ جو کشتواڑ کے عظیم الشان پہاڑ "ناگنا شیرو" کی عین چوٹی سے نکلتی ہے۔ میں نے ہمراہیوں اور اردگرد کے زمینداروں سے اس ندی کے نام شالامار کے متعلق بہت کچھ استفسارات کئے۔ ندی کا نام شالامار کب سے ہے۔ کیا اس نام کا نواحات ناگنا شیرو میں کوئی باغ بھی تھا؟ بصورت اثبات اس کو کس نے کس سنہ میں آباد کیا؟ ندی کو شالامار کیوں کہتے ہیں؟ لیکن کسی سوال کا کوئی جواب نہ مل سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوا۔ کہ یہ نام اس قدر قدیم عرصہ سے ہے کہ اس علاقہ میں کوئی شخص اس کی صحیح تاریخ نہیں بتا سکتا۔ راقم الحروف کا اپنا خیال یہ ہے کہ جس زمانہ میں ندی کا نام شالامار رکھا گیا ہے۔ وہ قدیم ہندو راجگان کشمیر کا زمانہ تھا۔ اس لئے کہ شالا ہندی لفظ ہے جس کے معنے گھر یا جگہ یا مقام کے ہیں۔ اور مار کشمیری زبان کا لفظ ہے جس کے معنے ندی نالہ کے ہیں۔ علاقہ کشتواڑ میں گو ہندو راجاؤں کی اپنی حکومت رہی ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ کشمیر کے قدیم ہندو راجگان کو ہمیشہ ان پر فوق رہا ہے۔ اور کشمیر کی زبردست ہمسائیت کی وجہ سے کشتواڑ کے راجوں کو عموماً ان کا زیردست رہنا پڑا ہے۔ کشتواڑ اور بھدرواہ

کے علاقوں میں اب بھی بہت سے کشمیری موجود ہیں۔ اور ہر چند وہ سب قریباً مسلمان ہی ہیں۔ لیکن آخر یہ انہی لوگوں کی اولاد ہیں۔ جن کے بزرگوں نے آٹھویں صدی ہجری میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان سطور کا مطلب یہ ہے۔ کہ ان علاقوں میں کشمیریت کے آثار جن کی یادگار یہ نالہ شالامار ہے اب بھی پائے جاتے ہیں۔

مادھولال حسین

یہ وہی بزرگ ہیں جن کے نام پر اور جن کے عُرس کی وجہ سے لاہور کا میلہ چراغان مشہور ہے۔ اور جس میں لاہور ضلع لاہور اور مضافات لاہور کے علاوہ امرتسر۔ گوجرانوالہ۔ وزیر آباد۔ ایمن آباد تک سے لوگ آتے ہیں۔ مجمع عام کی تعداد کا صحیح شمار تو کبھی نہیں ہوا۔ لیکن عام اندازہ ایک لاکھ کے قریب کیا جاتا ہے۔

"مادھولال حسینؒ" بظاہر ایک انمل اور بے جوڑ سا نام معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ نام ہندو مسلم اتحاد کا علمی ثبوت اور طوطئ ہند امیر خسرو دہلوی کے اس شعر کا صحیح مصداق ہے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس کی تفصیلات آگے چل کر معلوم ہونگی۔

حسینؒ کے والد کلس رائے نام ایک ہندو راجپوت نے بعہد شہنشاہ ہمایوں دین اسلام قبول کیا حسین کی ولادت ۹۴۵ھ میں ہوئی۔ چنانچہ صاحب حقیقت الفقراء لکھتے ہیں

چوں وجود مبارکش بہ جہاں | آمد از پردہ عدم بہ وجود
بود آں سال در شمار عدد | چہل و پنج زیادہ بر نہ صد
۹۴۵ھ

لہ تاریخ لاہور کنہیا لال میں درج ہے۔ کہ حسین کلس رائے کا پوتا تھا۔

حسین مولوی ابوبکر کی درسگاہ میں داخل ہوئے - جو اُس زمانہ میں ٹکسالی دروازہ کے باہر دریا کے کنارہ پر تھی - دس سال کی عمر تھی کہ قرآن شریف حفظ کر لیا - اسی زمانہ میں ایک بزرگ حضرت شیخ بہلول ان سے ملے - اور انہوں نے اس کی رُوحانی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی ؎

کتاب حقیقت الفقرا[1] میں جس کے بعض اقتباسات حضرت حسین کے متعلق تحقیقات چشتی میں درج ہیں - حضرت حسین کے مفصل حالات فارسی نظم میں درج ہیں - اور اُن میں اُن کے بہت سے خوارق عادات اور اُن کی کرامات کا ذکر ہے ؎

مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں - میں ایک مرتبہ میاں حسن علیشاہ سجادہ نشین مزار مادھو لال حسین کے پاس گیا - اُس نے مجھے ایک بیاض دکھائی - جس میں حضرت حسین کے طبعزاد اشعار درج تھے - مگر اکثر اشعار ایسے تھے - جن کا قافیہ اور ردیف تو الگ وزن تک بھی درست نہ تھا - بخوف طوالت آپ کے کلام سے صرف دو شعر جن کا وزن قافیہ درست ہے - یہاں درج کئے جاتے ہیں

؎ شاہدے خود را چو دیدم مست مست ٭ تا لبِ لعلش رسیدم مست مست

؎ ما ہمہ دردیم و درماں نیز ہم ٭ بادۂ صافیم و مستاں نیز ہم

حضرت حسین فارغ التحصیل ہونے کے بعد معاش کے لئے بافندگی کا کام کرتے رہے - ان کے ایک پیر بھائی شیخ ارزانی نام تھے - ان دونوں کی آپس میں چشمک تھی - حقیقت الفقرا میں لکھا ہے - کہ حضرت حسین کے بعد جب شیخ ارزانی ان کے مزار[2] پر آئے تو ٹھوکر لگا کر کہا ؎

خفتۂ زیرِ خاک اے جولاہ ٭ از من و خود نہ کنوں آگاہ

---

[1] یہ کتاب راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری - تحقیقات چشتی اور تاریخ کنہیا لال میں اس کے حوالے درج ہیں - پیر محمد نام کوئی بزرگ اس کے مصنف ہیں - اور انہوں نے حشم و دیگر کرامتیں لال حسین کی لکھی ہیں - شیخ پیر محمد حضرت مادھو کے خادم خاص تھے - حقیقت الفقرا ۱۰۷۱ھ بعہد عالمگیر کی تصنیف ہے - [2] حضرت حسین (باقی حاشیہ بر صفحہ)

ور تو از حالِ خویش آگاہی	گو بمن شیر یا تو روباہی
ایں سخن چوں اژد شنفت حسین	از تہِ خاکِ گور گفت حسین
کاے عجب ایں چہ گفتن است بمن	از تو انساں چہ لائق است بمن
یا بگویم ہمے زنی از کیں	باز گوئی تو زینکہ حرف چنیں
گر نباشم ز حالِ خود آگاہ	پس من آگاہ کے شوم زالہ
بشنو از من کہ من خود آگاہم	چوئے الہ ام بگوئہ جولاہم
من کہ گویم سخن بہ گور دلیر	پس تو خود بیں کہ روبہ ام یا شیر

جب تک شیخ حسین نے طریقۂ ملامتیہ اختیار نہیں کیا تھا۔ نماز روزہ کے بڑے پابند تھے۔ قرآن شریف بلا ناغہ پڑھا کرتے اور قریباً ہر روز مزار حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش پر جا کر فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں دفعتاً تبدیلی پیدا ہو جانے کی یہ حکایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک دن شیخ سعد اللہ نامی ایک معلم ایک تفسیر سامنے رکھ کر اس امر کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ کہ زندگی بے اعتماد اور لہو لعب ہے۔ شیخ حسین نے کہا۔ جب خدا نے دنیا کی زندگانی کو لہو و لعب قرار دیا ہے تو اس کی تمام مخلوق ہی ایک لہو و لعب ہے۔ پھر ہم لہو و لعب ہی کیوں نہ کریں جو اس کھیل بنانے والے کا مقصد خاص ہے۔ یہ کہا اور اُچھلتے کودتے اور ناچتے ہوئے مدرسہ سے باہر نکل آئے اور کپڑے بھی گیروے (سُرخ) رنگ کے پہننے شروع کر دیئے جس سے اُن کا نام "لال حسین" مشہور ہو گیا +

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) کے حالات کتاب بہار یہ۔ حقیقۃ الفقرا اور سیر العارفین میں درج ہیں۔ ان میں اس قسم کی بہت سی کرامات ان کی درج ہیں۔ لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ ایک اہل اللہ (شیخ ارزانی) اپنے پیر بھائی کی قبر کو اُسکے مرنے کے بعد آکر ٹھوکریں مارے اور اس قسم کے کلمات اس سے کہے حضرت حسین کی عین حیات میں اس قسم کا مکالمہ ہوا ہو۔ تو تعجب نہیں ہے + بعمر ۲۶ سال ۹۸۱ھ میں آپنے "ساقی و مطرب و شراب و رباب + بر گزیدہ و کرد ہیچ حجاب" پر عمل کیا +

اس واقعہ کے بعد لال حسین کی زندگی میں ایک عجیب قسم کا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی تمام کتابیں دریا برد کر دیتے ہیں یا کسی کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں قرآن شریف کی تلاوت۔ علمی و صوفیانہ تذکروں اور ورد و وظائف کی جگہ شراب کے دور شروع ہو جاتے ہیں۔ مکتبوں اور مسجدوں کی بجائے مے خانوں کا طواف پسند آتا ہے اور چنگ و رباب سے وابستگی ہو جاتی ہے۔

لال حسین کی ایک کرامت کا ذکر صرف پُر لطف سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ لاہور میں شیخ حسّو تیلی ایک بزرگ گذرے ہیں۔ اوائل میں گندم فروشی کا کام کرتے تھے حضرت شاہ جمال کے فیضِ صحبت سے اپنی عاقبت سنوار لی۔ کچھ عرصہ کے بعد تیل بیچنا شروع کیا۔ اور حسّو تیلی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ دوکان ان کی چوک جھنڈا موری دروازہ میں تھی۔ حضرت لال حسین اسی رستے کبھی کبھی مستانہ حالت میں ہی حضرت داتا گنج بخش کے مزار پُر انوار پہ جایا کرتے تھے۔ جب حسّو تیلی کی دوکان پہ پہونچتے۔ تو وہاں معمول سے زیادہ شور و غل کرتے اور اُچھلتے کودتے۔ ایک دن حضرت حسّو تیلی نے کہا دربارِ رسالت میں تو تمہیں کبھی دیکھا نہیں یہ اُچھل کود کس شئی پہ ہے۔ لال حسین نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور اپنے اسی سرور میں مست چلے گئے۔

اسی رات حضرت حسّو تیلی خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ بزم نبوی سجی ہوئی ہے سرورِ کائنات اونق افروز ہیں ایک چھوٹا سا خوبصورت لڑکا حضرتؐ کی گود میں آتا ہے۔ آنحضرت صلعم اس کو پیار کرتے ہیں۔ پھر وہ لڑکا تمام فقیروں۔ ولیوں اور صحابۂ کرام سے پیار لیتا ہوا شیخ حسّو تیلی کی گود میں آتا ہے۔ اور بچّوں کی عادت کے مطابق ان کی ڈاڑھی سے چند بال نوچ لیتا ہے اور مجلس برخاست ہو جاتی ہے۔

دوسرے دن لال حسین اُسی طرح شور و غل مچاتے چوک جھنڈا سے گذرتے ہیں۔ شیخ حسّو تیلی ان کو دیکھ کر مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں فقیری اور ولایت کا دعویٰ کس کام۔ جب دربارِ نبوی تک رسائی نہیں۔ لال حسین نے اس کے جواب میں ڈاڑھی کے چند بال دکھائے۔ اور واقعہ کا ذکر کیا۔ حسّو تیلی نے کہا۔ آخر معصوم

بچہ بن کر نذر پہنچائی۔ بات جب تھی کہ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوتے۔ یہ کہکر حضرت حسّو تیلی نے حضرت حسینؒ کو گلے لگا لیا۔ اور فرط جوش و سرور سے حسّو حسین حسینؒ کر کے نعرے مارنے لگے۔

آخر وہ دن بھی آگیا۔ کہ اس مست الست فقیر کو اپنے مریدوں معتقدوں اور یاران ہم جلیس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑا۔

صاحب حقیقت الفقراء نے وصال کی کیفیت اس طرح لکھی ہے۔ آپ یاروں کے ہمراہ ایک روز کشتی پر سوار دریا (راوی) کی سیر کر رہے تھے۔ ایک موقعہ پر ایک ریگستان نظر آیا۔ کشتیبان کو اشارہ کیا۔ اُس نے وہاں اُتار دیا۔ آپ نے تیر و کمان سے دل بہلانے کا ارادہ کیا۔ دو چار تیر چلائے بھی۔ مگر پھر دفعتہً دل میں ایک خیال آگیا اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ دوستو! جب کوئی دوست حقیقی اپنے دوست کو اپنے پاس بُلائے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع احباب نے جواب دیا۔ کہ اسے سب کام چھوڑ کر اپنے حقیقی دوست کا کہنا ماننا چاہیئے۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا۔ اے بزم احباب یہ شمع انجمن داہنی طرف اشارہ کر کے اب تُجھنے کو ہے۔ یعنی ہمیں جناب الٰہی اپنے وصال میں طلب فرماتے ہیں۔ یہ کہہ کر بقول صاحب حقیقت الفقراء سے

بہ ہماں ریگ گسترید ردا ۔۔۔ بہ ردا خفتہ و داد جاں بخندا
وقت جاں دادن از دلش ناگاہ ۔۔۔ نالہ آمد بروں کہ حق اللہ
چوں حق اللہ گفت جاں بسپرد ۔۔۔ بادۂ وصلت الٰہیہ خورد

شاہدرہ کے متصل جو جگہ حضرت لال حسینؒ نے اپنے لئے پہلے ہی پسند فرمائی تھی وہاں آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ کی وفات کا واقعہ بعہد اکبر ۲۵ جمادی الثانی ۱۰۰۸ھ کو پیش آیا۔ اس حساب سے آپ کی عمر ۶۳ سال کے قریب تھی۔

چند سالوں کے بعد جب دریائے راوی میں سیلاب آگیا[1] اور پانی کی لہر یں حضرت

[1] حقیقت الفقراء کے حوالہ سے تحقیقات چشتی میں لکھا ہے۔ کہ یہ سیلاب حضرت کی پیشگوئی کے مطابق ان کی وفات سے بارہ برس کے بعد آیا تھا۔ اور لاش کی جگہ ان کے مرید کو قبر میں ایک گلدستہ لٹکتا ہوا نظر آیا۔ اسی گلدستہ کو موجودہ مزار میں دفن کیا گیا۔

کے مزار سے جو اُس وقت کچا تھا۔ ٹکر کھانے لگیں۔ تو محمد صالح نامی آپ کے مرید نے آپ کو باہر نکالا۔ اور آپ کو باغبانپورہ میں جسے اُس زمانہ میں بابوپورہ کہتے تھے دفن کیا۔ اس وقت نمازِ جنازہ دوبارہ پڑھی گئی۔ آپ کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد ہزار ہا تک تھی۔ مگر سجادہ نشینی کا فخر آپ کے محبوب و مرغوب مرید حضرت مادھولال حسین کو ملا۔

شیخ مادھولال

مادھولال شاہدرہ کے ایک برہمن کا لڑکا تھا۔ ایک دن گھوڑا دوڑاتا حضرت شیخ حسین کی جھونپڑی کے سامنے سے گذرا۔ شیخ حسین اس کی فراست اور اس کی خوبصورتی اور جوانی دیکھ کر پھڑک اُٹھے۔ پوچھا کون ہے؟ کسی نے جواب دیا۔ شاہدرہ کے ایک امیر برہمن کا لڑکا ہے۔ اور نام اس کا مادھولال ہے۔

شیخ ان دنوں قلندرانہ وضع رکھتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھ سب کی صفائی تھی۔ شراب برملا پیتے تھے۔ اور شراب خانہ میں سب کے روبرو چلے جاتے تھے۔ ایسے شخص کا ایک ایسے نوجوان خوبصورت لڑکے سے اظہارِ محبت کرنا جو اُس کا ہم خیال و ہم عقیدہ بلکہ ہم مذہب بھی نہ ہو۔ سب کے لئے حیرت ناک تھا۔ مگر عشق وہ چیز ہے کہ نشیب و فراز۔ بدنامی و رسوائی کوئی چیز اس پر غالب نہیں آسکتی۔ شیخ بھی شاہدرہ میں تلاشِ یار کے لئے گئے۔ اور آخر کامیاب ہو گئے۔ اُس زمانہ میں مادھو کی عمر ۱۶ سال تھی۔ اور اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔

جب یہ واقعہ مادھو اور اُس کے والدین کو معلوم ہوا۔ تو وہ بہت گھبرائے۔ مگر حضرت شیخ حسین کا عشق معمولی عشق نہ تھا۔ آخر بقول ڈاکٹر اقبال ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں۔ طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

رفتہ رفتہ مادھو کے دل پر بھی اثر ہوا۔ اور اب وہ وقت آیا کہ وہ بھی کبھی کبھی

حضرت کی بزم میں آنکلتا۔ اور شراب نوشی میں بھی مشغول ہوتا۔ مادھو کے والدین کو بیٹے کا یہ حال دیکھ کر سخت فکر دامنگیر ہوا۔ شیخ لال حسین کے قتل کے منصوبے سوچے جانے لگے۔ اِدھر اُدھر بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیابی نہ ہوئی ﴿

آخر اُس کے والدین نے ہردوار جانے کے بہانہ سے بیٹے کو ساتھ لے جانا چاہا شیخ لال حسین نے پہلے تو اجازت نہ دی۔ مگر جب مادھو نے اصرار کیا۔ تو انہیں سِراج یار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا ﴿

حقیقت الفقراء میں تو ہردوار کے اس واقعہ کو بھی حضرت حسین کی ایک کرامت بیان کیا گیا ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ شیخ حسین نے اجازت تو دیدی مگر یہ وعدہ لے لیا کہ تمہارے والدین پہلے چلے جائیں۔ میں تم کو خود ہردوار پہونچا دوں گا۔ چنانچہ جب وہ مادھو کے ماں باپ ہردوار پہونچے ہیں۔ اسی دن شیخ حسین نے مادھو کو کہا کہ میرے قدم پر قدم رکھو اور آنکھیں بند کرلو۔ زمین پر پیر مارو اور پھر آنکھیں کھول دو۔ مادھو نے اس پر عمل کیا تو اپنے آپ کو ہردوار میں پایا جہاں اس کے والدین بھی موجود تھے ﴿

بہرحال یہ کرامت ہو یا اصل واقعہ۔ مادھو لال کا ہردوار جانا ثابت ہے۔ جب وہ واپس آیا تو اُس کے اعتقاد اور اُس کی محبت میں کوئی کمی نہ تھی۔ بلکہ واپس آنے کے چند دنوں کے بعد وہ علانیہ مسلمان ہو گیا ﴿

بہت سے ہندوؤں نے یہ صلاح کی کہ لال حسین اور مادھو دونوں کو ہلاک کر دینا چاہئے۔ لال حسین کو اپنا تو مطلق اندیشہ نہ تھا۔ مگر مادھو کی جان کو وہ نہایت عزیز رکھتے تھے۔ اسی اثنا میں راجہ مان سنگھ کو اکبر کی طرف سے مہم دکن پر جانے کا حکم ہوا۔ لال حسین کے ایما سے مادھو مہم دکن میں بھرتی ہو کر لاہور سے باہر چلے گئے۔ اور اُس وقت واپس آئے جب مہم دکن میں راجہ مان سنگھ نے کامل فتوحات حاصل کر لیں۔ شیخ حسین کے نام سے راجہ مان سنگھ خوب آشنا تھا جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ میری فوج میں مادھو نام ایک نوجوان لڑکا حضرت حسین

کا مرید ہے۔ تو اُس نے اُس کو اپنے پاس بُلایا۔ اُس کی عزت کی اور کہا۔ اپنے پیرو مرشد کا تصور باندھ کر اس مہم میں اُن کی دعا حاصل کرو۔ مادھو نے ایسا ہی کیا اور جب مان سنگھ کو کامیابی ہوگئی۔ تو اُس کا اعتقاد لال حسین کے متعلق بہت زیادہ ہوگیا؁

ایک مرتبہ ہولی کے ایام تھے۔ لال حسین نے کہا ہم اپنے یار جانی (مادھو) کی خاطر ہولیاں کھیلنا چاہتے ہیں۔ مادھو لال کا اتنا سُننا تھا۔ کہ یہ ناز معشوقانہ بہت سا گلابی رنگ اُس نے حضرت لال حسین پر ڈال کر اُن کے تمام کپڑے لت پت کر دیئے۔ حضرت کے مرید اور معتقد لال حسین کی اس شوخی پر لال پیلے ہوگئے بلکہ حضرت لال حسین سے اُنہوں نے کہہ بھی دیا۔ آپ نے اس چھوکرے کو سر چڑھا رکھا ہے۔ حضرت لال حسین تو کسی اور ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان پر وجد کی حالت طاری ہوگئی اور اُنہوں نے ناچنا شروع کر دیا؁

اسی طرح بسنت کے موسم میں لاہور کی اکثر طوائفیں بسنتی رنگ کے کپڑے پہن کر جب . . لال حسین کے سلام کو آتی تھیں۔ تو آپ کے مرید و معتقد بھی اسی رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ مادھو لال اور خود حضرت لال حسین بھی "سر تا پا بسنت" نظر آتے تھے؁

لال حسین تا حین حیات ہر سال بسنت کی خوشی منایا کرتے تھے۔ ان کے بعد بھی ان کے مزار پر بسنت کے دن سرود و سماع اور رقص و رنگ اندازی ہوتی ہے لال حسین اور شیخ مادھو نے یہاں تک یکرنگی اختیار کی۔ کہ دونوں کا نام مادھو لال حسین مشہور ہوگیا۔ اور عوام اب اصلیت سے یہاں تک بے خبر ہیں کہ مادھو لال حسین کو ایک ہی نام تصور کرتے ہیں۔ اور اصل حقیقت و کیفیت سے بالکل بیخبر ہیں۔ آخر جب حضرت مادھو باغِ عالم کی سیر سے سیر ہوگئے۔ اور اپنے پیر و مرشد اور عاشق صادق کی یاد دل میں ایک ٹیس اور کلیجہ میں درد پیدا کرنے لگی۔ تو ملک بقا کے سفر کی تیاری کی۔ چنانچہ حضرت حسین کی وفات کے اٹھتالیس سال بعد ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ

کو دوشنبہ کے دن شاہجہان کے زمانہ میں انتقال فرمایا۔ اور ہم پہلوئے مزار حضرت لال حسین دفن کئے گئے ۔

خانقاہ مادھو لال حسین

لاہور کی یہ مشہور و معروف خانقاہ جو موضع باغبانپورہ کے متصل بجانب شمال واقع ہے۔ پختہ چاردیواری سے محفوظ ہے۔ دروازہ کلاں جو آمد و رفت کے لئے ہے مغرب کی طرف ہے۔ ایک دروازہ جنوب یعنی باغبانپورہ کی جانب ہے۔ مشرق کی طرف بھی ایک دروازہ ہے جس کو بہشتی دروازہ[1] کہتے ہیں ۔

احاطۂ دربار یعنی خانقاہ حضرت مادھو لال حسین کی زمین کا رقبہ چار گھماؤں کے قریب تھا۔ مگر بہت سی عمارتیں کھنڈرات کا ڈھیر ہو گئیں۔ باغ باغیچہ جو تھا وہ ویران ہو گیا۔ چاردیواری بالکل شکستہ ہو گئی۔ اگر یہ مزار شہر میں کسی جگہ ہوتا۔ تو آج اس کے ٹوٹے پھوٹے آثار بھی نظر نہ آتے۔ مجاور اور سجادہ نشین اور متولی سب مل ملا کر کھا پی جاتے اور صرف مادھو لال حسین کا مزار اور چبوترہ باقی رہ جاتا۔ اس لئے جو کچھ بھی اب باقی ہے غنیمت ہے ۔

نواب ذکریا خاں نے نظامت لاہور کے ایام میں بعہد محمد شاہ بادشاہ ایک خوشنما کانسی کار مسجد حضرت لال حسین کے روضہ کے مغرب کی طرف تعمیر کرائی تھی۔ وہ مسجد تو موجود ہے۔ مگر اسلامی حکومت کے ضعف۔ مسلمانوں کی غفلت اور جابر حاکموں کی غیر ہمدردی کی وجہ سے اب صرف اس کے آثار ہی قائم ہیں۔ جو اس کی مٹی ہوئی شان و شوکت کی شہادت دیتے ہیں مسجد کے ساتھ کنواں۔ غسل خانہ۔ سقاوہ بلکہ چاہ کلاں بھی جنوب رویہ موجود ہے۔ مسجد کا دروازہ جو بہت شاندار تھا اب بغیر طاق تختوں کے ہے۔

---

[1] اس نام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ حضرت لال حسین نے فرمایا تھا۔ کہ بسنت کے دن جو کوئی اس دروازہ سے گذریگا وہ بہشتی ہے ۔

صحن مسجد موجود مگر ناگفتہ بہ حالت میں۔ صحن کے گرد جو دیوار ہے وہ تا بہ گردن بلند تھی۔ مسجد کا دروازہ سطح زمین سے دو تین فٹ بلند تھا۔ اور پختہ زینوں کے ذریعے مسجد میں داخل ہوتے تھے۔ غرب رویہ جو مسقف درجہ تھا شکستہ ہو جانے کی وجہ سے ایک اہل دل بزرگ منشی غلام رسول ملازم بارکماسٹری نے ۱۲۶۹ھ میں دوبارہ اس کی مرمت کرادی تھی۔ مگر اب پھر وہی حال ہے۔

۱۲۸۰ھ کے قریب مسجد کے بہت سے آثار موجود تھے۔ تحقیقات چشتی میں مسجد کی عمارت کے متعلق اس کی تفصیلات درج ہیں۔ شرقی محراب میں رُخ مسجد کے اوپر نیلا۔ آسمانی۔ سفید اور کاشی کار کام نہایت خوبصورت تھا۔ اور بخط عربی بسم اللہ الرحمن الرحیم اور پھر افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ و بہ نستعین درج ہے۔

شمالی محراب کی طرف کاشی کار ٹکڑوں میں جن کی زمین نیلی اور گلکاری سفید ہے برنگ سیاہ یہ ابیات تحریر ہیں ؎

خواست در دورِ شاہ مُلک پناہ　　شاہِ ہندوستاں محمد شاہ
عالم و عادل و سخی زماں　　در صفِ معرکہ چو شیر ژیاں
زُبدۂ بارگاہِ او نواب　　ذکریا خان صوبۂ پنجاب
بدخواہش اگرچہ جمشید است　　لرزہ در تن فتادہ چوں بید است

یہ چاروں مصرعے دو سطروں میں ختم ہیں۔ اس کے بعد یہ اشعار درج ہیں ؎

نیک نام کہ نیک نامےؑ او　　ہم چو بوئے گل است در ہر سو
چاہ و مسجد نہ خود بنا بکند　　عالی و خوب و خوشنما بکند
محض بہرِ خدا کند ایں کار　　تا نمازی شود نماز گذار
باز ہر چہ ثواب زاں آید　　بہ سوئے بانیش بجن عاید

محراب جنوبی کی طرف بھی شمالی محراب کی طرح کاشی کار کام کے چار ٹکڑے بنا کر ان کے وسط میں تعمیر مسجد کا حسب ذیل قطعہ تاریخ درج ہے ؎

یارب از لطفِ خود نگاہش دار　　از شکستن تو در پناہش دار

کرد احداث مسجدے محکم ‏ ‏ نیز ایں حوض و چاہ مستحکم
نزدِ درگاہِ صاحبِ عرفاں ‏ ‏ واقفِ اسرارِ حضرتِ رحماں
آنکہ معروف شد بہ لال حسین ‏ ‏ خاکِ نعلین اوست سُرمۂ عین
کرد معمار چوں بصد تدبیر ‏ ‏ مسجد و چاہ را بکو تعمیر
سالِ تاریخ او چنیں آمد ‏ ‏ مسجد نیک ماشیجاں[1] ..

اس کے ساتھ ہی دوسرا قطعۂ تاریخ بھی درج ہے جو حسب ذیل ہے ؎

چوں ایں مسجد گاہ از پے خاص عام ‏ ‏ بنا یافت از سرورِ نیک نام
ز تاریخ او ہر کہ خواہد شمار ‏ ‏ بداند ہزار و صد و چہل و چار

مسجد کی دیواروں اور محرابوں کے سرخولوں وغیرہ پر نقش و نگار کی شہادت کے لئے رنگ آمیزی خطوط کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں ۔

احاطۂ دربار میں ایک مکان ۔ مکان ثبوت شاہ کے نام سے ہے۔ وہ حضرت مادھو لال حسین کے خدام ہی سے تھے۔ ان کو بھی صاحبِ کرامات بیان کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ انہی کی مہربانی سے لاہور احمد شاہ ابدالی کی لوٹ سے محفوظ رہا۔ ۱۲۱۱ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس مکان کی غربی جانب ثبوت شاہ کی تصویر معہ شراب کی بوتلوں کے اُن کے مذاق اور اُن کے حالات کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے۔

دروازۂ کلاں یعنی ڈیوڑھی حضرت مادھو لال حسین کی وفات کے بعد مسخ کر کے از سرِ نو بنوائی گئی۔ البتہ اس کا اندرونی در محرابی زمانہ قدیم ہی کا ہے۔ بعہدِ مہاراجہ دلیپ سنگھ اس ڈیوڑھی کو سات زینہ لگا کر دو منزلہ بنایا گیا۔

چاہِ کلاں جو مسجد کے متصل ہے اس پر چرخ چوب جاری تھا۔ ۱۲۷۵ھ میں میر وزیر علی تحصیلدار لاہور نے اس کو بند کرا دیا۔ اس چاہ کے شمال کی طرف چار دیواری کے اندر ایک چبوترہ چونہ گچ سفید ہے۔ یہ مقام شیخ ارزانی کا چلہ گاہ بتا جاتا ہے۔ جو لال حسین کے پیر بھائی تھے۔ اور جن کا مزار پٹنہ میں ہے۔ اب یہ چبوترہ

[1] آگے حرف ٹوٹ گئے ہیں۔ پڑھے نہیں جاتے ۔

بوسیدہ ہو کر گر گیا ہے۔ اور اس میں درخت کریر وغیرہ اُگے ہوئے ہیں ۔

چار دیواری کے اندر ایک موہڑہ کلاں ہے۔ جس کا دَور ہر طرف سے ساڑھے تین گز ہے۔ اس کے جنوب کی طرف ایک حجرہ مسجد ہے۔ جہاں شیخ مادھو نشست فرمایا کرتے تھے ۔

وہ بخار چہ بارہ دری، جس کی بیرونی دیوار پر بجانب مشرق سنگ مرمر کے پتھر پر "این مکان از بندہ غلام رسول" لکھا ہوا ہے۔ سجادہ نشین کے بیٹھنے کی جگہ ہے اور اسی مقام کو گدی بھی کہتے ہیں۔ مقام گدی کے متصل ایک اور مسجد ہے جو ۱۲۷۵ھ میں بیگم طوائف والدہ مومان محبوبہ رنجیت سنگھ نے تیار کرائی تھی مسجد نہایت خوبصورت ہے۔ اُس زمانہ میں اس مسجد پر دو ہزار روپیہ لاگت آئی تھی ۔

احاطہ دربار کے اندر اس وقت ساٹھ ستر سے زیادہ قبریں خدام اور دربار کے فقراء کی ہیں کچھ متفرق بھی ہیں۔ احاطہ مزار کی چار دیواری میں بیسیوں مکانات اور کئی گنبد خورد و کلاں تھے۔ ان میں سے بہت سے مٹ گئے۔ بہت سے باقی ہیں۔

مقام تخت جس کو چبوترہ مزار معلّی بھی کہتے ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ معز الدین بن جہاندار شاہ کا بنا کردہ ہے۔ یہ تمام چبوترہ چونہ گچ ہے۔ اس کے چاروں طرف پنجرہائے رنگین خشتی نصب ہیں۔ اور چاروں گوشوں پر چار مینارہ تا بسینہ بلند ہیں چبوترہ ہذا کے جنوب کی طرف ایک چوکھٹ سنگِ مرمر کی سوا گز بلند اور ۱۲ گرہ چوڑی ہے۔ اب اس میں تختہ ہائے چوبی لگے ہوئے ہیں ۔

اسی احاطہ میں ایک چبوترہ ہے جس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے عہدِ حکومت

لہ بہادر شاہ شاہ عالم بن عالمگیر کے بعد بعمر ۶۲ سال ۱۸ محرم روز جمعہ ۱۱۲۴ھ کو تخت پر بیٹھا۔ اور گیارہ ماہ پانچ یوم کی حکومت کے بعد ۱۱۲۵ھ میں انتقال کر گیا۔ معز الدین ابھی گردش کے ایام میں لاہور میں تھا۔ اس نے مزار حضرت مادھو لال حسین پر حاضر ہو کر یہ اقرار کیا۔ کہ اگر مجھے تخت نصیب ہو گیا۔ تو میں حضرت کے مزار پر سائبان چوب ہائے طلائی نذر کروں گا چنانچہ اس نے تخت نشین ہو کر اپنا وعدہ پورا کیا ۔

میں بسنت کے دن ڈیرہ کیا کرتے تھے۔ اس چبوترہ کے پاس سائبان اور قناتیں لگ جاتی تھیں۔ جہاں امرائے دربار قیام کرتے تھے۔ مہاراجہ بسنت کے دن دربار مادہو لال حسین میں خود بھی نذر دیتے اور اپنے امیروں سے بھی نذریں دلواتے تھے۔ بقول نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ ۱۸۳۹ء اور ان کے بعد مہاراجہ شیر سنگھ و مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد حکومت ۱۸۴۹ء تک زندہ[۱] تھے لکھتے ہیں "بسنت کے صرف ایک ہی دن میں سجادہ نشین کو چار پانچ ہزار روپیہ نذر نیاز کا مل جاتا تھا۔ اور اب دسمبر ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں (اب روز میلہ بسنت صرف ۲۷۵ روپیہ سجادہ نشین کو آمدنی ہوئی ہے"۔

لال حسین کے تعویذ پر ہمیشہ غلاف پڑا رہتا ہے۔ اس تعویذ کے نیچے تین چبوترے ہیں جن میں سے دوسرے پر شیخ مادہو کا مزار ہے۔ جس پر عرس کے دن غلاف ڈالا جاتا ہے۔ چبوترہ کو مزار لال حسین کی وجہ سے تخت اور احاطہ مزار کو دربار بھی کہتے ہیں۔

راقم الحروف ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو مزار مادہو لال حسین پر گیا جن عمارات کا تحقیقات چشتی میں پتہ لکھا ہے۔ ان میں سے بہت سی مٹ گئی ہیں۔ اب تو احاطہ مزار اور مسجد نواب زکریا خان کے سوا چاروں طرف کھنڈرات ہی نظر آتے ہیں بلکہ جن عمارات کو راقم الحروف نے ۱۹۱۵ء میں دیکھا تھا۔ اب ان میں سے بھی کئی ایک نظر نہیں آتیں

مزار مادہو لال حسین پر نذر نیاز اور معافیات وغیرہ

لال حسین اور شیخ مادہو کی روش ظاہری ہرچند شریعت اسلام کے خلاف تھی۔ لیکن اس پر بھی ان کی بزرگی و شہرت کا اس قدر چرچا تھا۔ کہ ہزاروں اور لاکھوں لوگ ان کے سلسلہ میں داخل تھے۔ اور شاہان مغلیہ میں سے جو بادشاہ لاہور آتا تھا۔ وہ

---

[۱] آپ کا انتقال ۱۲۸۴ھ میں دوران طباعت تحقیقات چشتی میں ہوا ہے۔ آپ کی کتاب آپ کی وفات کے بعد چھپی تھی۔

دیگر مزارات کے علاوہ اس روضہ پر بھی حضور آتا تھا۔ نذریں چڑھاتا۔ سر تسلیم خم کرتا۔ اور مجاوروں سجادہ نشینوں کی بہت کچھ پرورش کرتا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جیسے خونریز بادشاہ بھی اس خانقاہ پر سر نیاز جھکا کر کبر و غرور کی کمر توڑ گئے ہیں۔ ناظمان لاہور بھی دل و جان سے لال حسین کے ارادتمندوں میں تھے۔ نواب زکریا خاں تو خصوصیت سے آپ کے خوارق عادات اور کرامات کا قائل تھا۔ خانقاہ کی مغربی جانب اس کی بنا کردہ مسجد جس کا مفصل ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اب تک اُس کی دلی ارادت مندی کا ثبوت دے رہی ہے ؀

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وجود لاہور کی اسلامی عمارات کے لئے ایسا ہی تھا جیسے بجلی کا تعلق کسی بلند آشیان یا کسی سر بفلک عمارت کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ لاہور کا کوئی اسلامی مقبرہ اسکی زد سے نہیں بچ سکا۔ کوئی مسجد اس کی ضرب سے خالی نہ رہ سکی۔ مگر مزار مادھو لال بڑا خوش قسمت تھا۔ کہ نہ صرف وہ سلامت رہا۔ بلکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ وہاں بسنت اور عرس کے دن خود آتا اور نذریں پیش کرتا ؀

صحیح ہے کہ اس مزار پر بہ نسبت اور مزاروں اور مقبروں کے سنگ مرمر اور دیگر قسم کا قیمتی پتھر کم تھا۔ اور اسی لئے خیال ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کی دستبرد سے بچ رہا ہے لیکن مزار کا رقبہ جو چار گھماؤں تک بیان کیا جاتا ہے اس قدر وسیع تھا۔ کہ رنجیت سنگھ چاہتا۔ تو اپنے کسی سکھ سردار کو توپ خانہ یا بارود خانہ کے لئے یہ جگہ دے سکتا تھا۔ اس لئے اس کے محفوظ رہنے بالکم سے کم رنجیت سنگھ کے ہر سال یہاں آنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہئے ؀

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ بیگم طوائف کو اس مزار کے ساتھ دلی عقیدت تھی چنانچہ اسی عقیدت مندی کے ثبوت میں اُس نے یہاں ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ بیگم چونکہ موراں طوائف کی والدہ تھی اور موراں رنجیت سنگھ کی وہ محبوبہ تھی۔ کہ اُس کے نام کا سکہ تک پنجاب میں چل گیا۔ اور بڑے بڑے درباری اور مصاحب کیا سکھ اور کیا ڈوگرے اس کا مجرا کرنے کے بعد مہاراجہ کا سلام کرتے تھے۔ اور جب تک طوائفیں اس مزار پر حاضری

آتی تھیں اور خصوصاً عُرس اور بسنت کے دن تو یہاں شاہدانِ بازاری کا جمگھٹا رہتا تھا۔ رنجیت سنگھ کو موراں کی خاطر منظور تھی اور موراں کو اپنی برادری کی اور اس کی برادری یعنی طوائفوں کو مادھو لال حسین سے دلی عقیدت تھی۔ اس لئے موراں طوائف کی طفیل یہ مزار مہاراجہ کے ہاتھوں سے نہ صرف بچ سکا بلکہ مہاراجہ ہر سال یہاں نذر بھی دیتا رہا ۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ صرف مہاراجہ کے آنے کی وجہ سے بسنت کے دن اس مزار کے سجادہ نشین کو چار پانچ ہزار روپیہ کی نقد امداد نذر نیاز کے ذریعہ مل جایا کرتی تھی۔ مہاراجہ نے خانقاہ کی مرمت اور فقیروں اور عُرسوں کے اخراجات کے لئے حکم دیا۔ کہ ہر چند میں بادشاہانِ مغلیہ کی برابری نہیں کر سکتا۔ تاہم بطور مدد امداد کچھ نہ کچھ حاضر کیا کروں گا۔ چنانچہ مہاراجہ نے اس مزار کے لئے مفصلہ ذیل معافیات واگذار کیں (۱) چاہ موراں والا یعنی موراں طوائف کا کنواں جس کی زمین ۳۶ بیگھہ ہے یہ معافی موراں طوائف کے انتقال کے بعد مزار مادھو لال حسین کے نام ہو گئی تھی (۲) چاہ جس کی زمین ۲۰ بیگھہ ہے (۳) چاہ ہیرو والا جس کی زمین ۳۴ بیگھہ ہے (۴) چاہ جس کی کُل زمین ۶۶ بیگھہ ہے (۵) ضلع امرتسر میں ایک چاہ جس کی زمین دس بیگھہ ہے (۶) موضع فتح گڈھ ضلع لاہور میں ایک بیگھہ زمین (۷) اٹاری ضلع امرتسر میں سات بیگھہ زمین (۸) موضع کوٹ بیگم میں تین بیگھہ زمین ۔

یہ معافیات سکھوں کے آخر عہد تک برابر قائم رہیں۔ بلکہ مہاراجہ کھڑک سنگھ مہاراجہ شیر سنگھ اور آخری سکھ مہاراجہ دلیپ سنگھ نابالغ ہی اس مزار پر بسنت کی تقریب میں آتے رہے ہیں ۔

عُرس مادھو لال حسین یا میلہ چراغان

عُرس کی تاریخ حضرت لال حسین کی تاریخ وفات سے ایک سال بعد شروع ہوئی ہے

جس کو آج یعنی ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں ۲۷۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ پہلے آپ کا عُرس قمری حساب کے مطابق ہوتا تھا۔ مگر اس خیال سے کہ تاریخ عرس کبھی سردیوں میں آجاتی ہے اور زائرین اور مسافروں اور سوداگرانِ اسپان کو موسم کی تبدیلی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے ۱۳۱۶ء میں ہمیشہ کے لئے تاریخ عرس کا یہ فیصلہ کر دیا گیا۔ کہ عُرس ہر چیت کی چودھویں اور ہر مارچ کے مہینے کی آخری تاریخ کو ہوا کرے۔ کیونکہ ان دنوں میں موسم بہار کے سبب زائرین کو گرمی و سردی کی ناقابلِ برداشت تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی۔ اب عُرس ہر سال کے ماہ مارچ کے آخری ہفتہ کی رات کو ہوتا ہے۔ چراغان کی روشنی سے تمام مزار اور اس کا احاطہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک اُٹھتا ہے۔ اس رات کو مزار کے وسیع رقبہ کی جو کیفیت سیر چراغان سے ہوتی ہے۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے رات کو دن کا سماں نظر آتا ہے۔ اور چونکہ جس طرف جاؤ۔ چراغ ہی چراغ نظر آتے ہیں۔ اس لئے عُرس کی بجائے اس کا نام میلۂ چراغان ہی مشہور ہو گیا ہے۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کہ زائرین اور عُرس پر آنے والے لوگوں نے کس زمانہ سے شالامار باغ میں میلۂ چراغان شروع کیا ہے۔ مگر اس قدر قیاساً ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ جب سلطنتِ مغلیہ کو ضعف آیا۔ تو ناظمانِ لاہور اور سکھوں کے زمانہ میں جو لوگ حضرت مادھو لال حسین کے عُرس پر آیا کرتے تھے۔ اُن میں سے اکثر لوگ تفریح طبع کے لئے شالامار باغ میں بھی چلا جایا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ دستور یہاں تک رواج پا گیا۔ کہ اصل غرض یعنی عُرس کو بہت لوگ بھول گئے۔ اور تمام رونق اور آمدورفت شالامار باغ ہی میں منتقل ہو گئی۔

آج سے نصف صدی پیشتر تک عُرس حضرت مادھو لال حسین پر لاہور کے علاوہ امرتسر کی طوائفیں بھی آتی تھیں۔ اور اپنی زرق برق پوشاکوں۔ اپنے حسنِ دلکش اور اپنی خوش آوازی کے جوہر دکھاتی تھیں۔

سجادہ نشینوں کا یہ حال ہے۔ کہ اُن کے اکثر افراد خادم گدائی کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ خانقاہ کے نام کوئی معافی یا جاگیر نہیں ہے۔ جہاں بڑے بڑے امراء و زادہ

خوش شامل وقت حاضر ہوتے تھے۔ جہاں امرتسر اور لاہور کی نامی اور چیدہ طوائفیں اور ملک کے مشہور و ممتاز قوال اہلِ بزم کو حال سے قال میں لاتے تھے۔ زمانہ کی روش نے اب اس قسم کے ہنگامے وہاں بہت کم کر دئے ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ اس قسم کی نامشروع حرکات بالکل بند کر دی جائیں۔

خانقاہ مادھو لال حسین اور مہاراجہ رنجیت سنگھ

گذشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ بسنت کے دن مہاراجہ رنجیت سنگھ خود دربار مادھو لال حسین پر آتے تھے اور نذر و نیاز دیتے تھے۔ اب تھوڑی سی کیفیت مہاراجہ کی سواری و حاضری کی تحقیقاتِ چشتی سے لکھی جاتی ہے۔ جس کے مصنف اُن دنوں بقید حیات تھے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

مہاراجہ کا یہ معمول تھا۔ کہ بسنت کے دن اپنے تمام امراء و وزراء اور افواج اور اُن کے ادنےٰ و اعلےٰ افسروں کو بسنتی لباس اور بسنتی وردی پہننے کا حکم دیتے۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کے زین۔ ہاتھیوں کے ہودج اور تمام اسلحہ جات کے غلاف بھی بسنتی ہوتے تھے اور ساتھ ہی حکم دیدیا جاتا تھا۔ کہ حضرت کے مزار پُر انوار پر بسنتی رنگ کے خیمے نصب کئے جائیں۔ بیخیں۔ قناتیں سب بسنتی رنگ کی ہوتی تھیں۔ قلعہ کے دروازہ سے لے کر مزار کی حد تک دو رویہ فوج بسنتی لباس پہنے ہوئے عجب بہار دکھاتی تھی۔ امیر و رئیس کو حکم تھا۔ کہ وہ بھی بسنتی رنگ کا لباس پہنیں اور اُن کے ملازم بھی۔ رعایائے شہر میں سے مردوں کے علاوہ ہندو ہوں یا مسلمان کئی ایک عورتیں اور بچے بھی اسی رنگ میں ملبوس نظر آتے تھے۔ غرض رنگیلے مہاراجہ کی خوش مذاقی سے شہر کے در و دیوار اور کوچہ و بازار بسنتی نظر آتے تھے۔

بسنت سے ایک دو دن پہلے بسنتی دستار رنگوانے کا نرخ اُس زمانہ میں چار آنے تک پہنچ جاتا تھا۔ مصنف تحقیقاتِ چشتی لکھتے ہیں۔ مجھے بخوبی یاد ہے عہد مہاراجہ شیر سنگھ

بروز بسنت احقر راجہ دینا ناتھ[1] کے پاس موجود تھا میری موجودگی ہی میں رنگریز اُن کی دستار رنگ کر لایا۔ راجہ صاحب نے رنگریز کو پانچ روپے نانک شاہی عنایت کئے رنگریز نے کہا۔ مہاراج! پانچ روپیہ تو فوج کے جمعدار اور صوبیدار بھی دیدیتے ہیں۔ میں تو زیادہ کا اُمیدوار تھا۔ یہ سُن کر راجہ صاحب نے تبسم فرمایا اور علاوہ نقدی کے ایک چوغہ قیمتی پچاس روپے کا عطا کیا۔

دو بجے کے قریب توپوں کی پیہم و مسلسل آوازوں سے اہل لاہور کو معلوم ہو جاتا کہ مہاراجہ کی سواری قلعہ سے روانہ ہو گئی ہے۔ سب لوگ بازاروں میں اور مکانوں پر سرکار کا جلوس دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ جب مہاراج کی سواری میلہ میں آتی۔ تو دل کو وہ لطف اور آنکھوں کو وہ سرور حاصل ہوتا تھا۔ کہ اب اُن ایام گذشتہ کا خیال بھی آجاتا ہے۔ تو چشم پُر آب ہو جاتی ہے"۔

ساٹھ ستر ہاتھی بسنتی ہودجوں سے سجے ہوئے عجب ہیبت اور جاہ و جلال دکھاتے تھے۔ چار پانچ سو گھوڑے جن کے زین مرصع اور بسنتی ہوتے تھے اپنی چہل پہل سے عجب عالم پیدا کرتے تھے۔ ڈیرہ سواران چار یاری اور دو رجمنٹ پیدل اردل کے جلو میں ہوتے تھے۔ مہاراجہ قلعہ سے لے کر تا مزار پُر انوار روپوں کی مٹھیاں بھر بھر کے تصدق کرتے اور دورویہ پھینکتے آتے تھے۔ جب مزار کی چار دیواری آجاتی۔ تو سواری سے اُتر کر پاپیادہ ہو جاتے۔ اور جب بہ ارادت تمام معہ روسائے عالیمقام برہنہ پا ہو کر خانقاہ کے دروازہ کے اندر قدم رکھتے۔ تو پھر توپ کی سلامی ہوتی جس سے سب کو معلوم ہو جاتا۔ کہ اب سرکار دربار میں پہنچ گئے ہیں"

مہاراجہ احاطہ دربار کے اندر جا کر ایک مقررہ چبوترہ پر بیٹھ جاتے۔ اور گیارہ سو روپیہ نقد معہ ایک بیش قیمت بسنتی دوشالہ کے خانقاہ پر نذر چڑھاتے۔ جبیں سائی کرتے اور پھر خیمہ شاہی میں رونق افروز ہو جاتے۔ جہاں عرش سے فرش تک سب کچھ بسنتی نظر آتا تھا۔ تمام ملازمین سے علی قدر مراتب نذریں لیتے اور خلعت ہائے فاخرہ

[1] اُس زمانہ میں دیوانی کا خطاب تھا۔ خطاب راجہ انگریزوں کے عہد میں ملا تھا۔

سے ان کو سرفرازی بخشتے۔ اور عطر عنبیر و گلال جشن ہولی کی طرح اُڑایا جاتا۔ پھر لالہ رُخان حور وش یعنی تمام طوائفانِ لاہور و امرتسر حسب الحکم وہاں حاضر رہتی تھیں مجرائے شاہانہ ادا کرتیں۔ اور نوبت بہ نوبت سرکار کی تفریح طبع کے لئے ناچ میں مشغول ہو کر انعامات گوناگوں سے سرافراز ہوتیں“ ؀

بسنت کے دن جس قدر روپیہ و اشرفی مہاراج کو بطور نذر حاصل ہوتا وہ خدمتگارانِ شاہی کو بہ تقریب انعام بسنت تقسیم کر دیا جاتا۔ بلکہ اس کے علاوہ ایک ایک ماہ کی تنخواہ تمام فوج سوار و پیادہ کو بطور انعام تقسیم ہوتی تھی۔ جب شام کا وقت قریب ہوتا۔ تو مہاراج انواب کی سلامی کے ساتھ شہر کو واپس چلے جاتے۔ اور جس طرح آتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے روپے اور چونیاں پھینکتے آتے تھے اُسی طرح واپسی کے وقت بھی روپیہ اور اشرفی کا مینہہ برساتے ہوئے قلعہ میں آجاتے تھے“ ؀

باغبانپورہ

جبو | پاک پٹن کے رہنے والے ایک غریب الوطن مسافر کو اُس کی یاوری قسمت اکبر بادشاہ کے حضور میں لے گئی۔ حکم تھا۔ کچھ کام بھی جانتے ہو۔ مسافر نے کہا۔ زمیندار ہوں اور زراعت و کاشتکاری کا کام بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بادشاہ کے حکم سے اس کو لاہور کے شمال مشرق کیطرف بنجر اور ویران زمین آباد کرنے کی اجازت ملی۔ خوش نصیب مسافر نے چار ہزار بیگھہ اپنے تصرف میں لا کر وہاں اپنے نام پر ایک گاؤں جبو آباد کیا ؀

رائے بابو | اس کے بیٹے رائے بابو کے زمانہ میں اس کو بہت ترقی ہوئی۔ اس نے موضع جبو کے پہلو میں اپنے نام پر بابو پورہ آباد کیا۔ لال حسین کے زمانہ تک اس موضع کا نام بابو پورہ رہی تھا۔ بعہدِ شاہجہان ۱۰۴۰ھ میں رائے بابو کی اولاد نے مہر جیٹھا کے پاس اِس

موضع کو فروخت کر دیا ٭

مہر جیٹھا مہر جیٹھا نے اس موضع کا نام باغبانپورہ رکھا۔ اس میں اپنے رہنے کے لئے پختہ مکانات تعمیر کرائے اور موضع کو خوب رونق دی۔ وہ مکانات تو اب کہیں نظر نہیں آتے۔ قدیمی قبرستان کی صرف چار دیواری موجود ہے ٭

مہر مہنگا مہر جیٹھا کے سسرال باغ دلکشا[1] واقعہ شاہدرہ کے داروغہ تھے۔ مہر مہنگا مہر جیٹھا کا بیٹا تھا۔ نہایت حسین اور قبول صورت۔ ایام طفولیت میں اپنے نانا کے ساتھ باغ میں جاتا تھا۔ اور کئی کئی دن وہیں رہتا تھا۔ اس زمانہ میں اس کی عمر پانچ چار سال سے زیادہ نہ تھی۔ بیگمات اور شہزادیاں جب باغ کی سیر کو آتیں تو پردہ کا اس قدر انتظام ہوتا تھا۔ کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ مگر مہنگا کی خوردسالی کی وجہ سے اُس کو کوئی روکاوٹ نہ تھی۔ وہ اپنی عمر کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کے ساتھ کھیلتا۔ دَوڑتا اور بچپن اور بھولا پن کی جو ادائیں ہیں بے تکلفی کے ساتھ ظاہر کرتا ٭

جب شاہجہان نے شالامار باغ کی تعمیر شروع کی۔ اُس وقت مہر مہنگا اپنی جوانی کے عالم میں تھا۔ اس کے نانا کا رسوخ بھی باغ دلکشا کے شاہی داروغہ ہونیکی وجہ سے سرکار دربار میں بہت کچھ تھا۔ اور مہر مہنگا کے بچپن کا تعارف بھی جو شاہزادوں اور اُمرائے دربار سے تھا - اب کوئی نہ کوئی نتیجہ پیدا کرنے والا تھا۔ ان دونوں باتوں نے مل کر مہر مہنگا کو شالامار باغ کا سب سے پہلا شاہی داروغہ مقرر کرا دیا۔ اس کے بعد مہر مہنگا کا رسوخ یہاں تک بڑھ گیا۔ کہ وہ لاہور کے تمام سرکاری باغات کا منتظم و مہتمم قرار پایا ٭

۱۰۸۰ھ میں بعہد عالمگیر مہر مہنگا کا انتقال ہو گیا ٭

مہر مہنگا کی اولاد مہر جیٹھا بانی موضع باغبانپورہ کو غالباً لکھا پڑھا نہیں تھا۔ البتہ مہر مہنگا اس خیال سے کہ اُمرائے دربار اور شاہزادوں تک اُس کی رسائی اور نشست برخاست تھی۔ مروجہ علوم سے واقف تھا۔ اس نے اپنی اولاد کو نہ صرف پڑھایا بلکہ وہ اچھے اچھے فاضل

[1] اسی باغ کا نام اب باغ نورجہاں یا مقبرہ جہانگیر ہے ٭

مشہور ہوئے۔ اس کے بیٹے بھی قابل تھے۔ اور اس کے پوتے اور پڑپوتے تو علاوہ علوم درسی میں ماہر ہونے کے قرآن شریف کے بھی حافظ تھے۔ اور شالامار باغ کی خدمت داروغگی بھی انہی کے سپرد تھی ٭

زمانۂ بے اطمینانی | نادر شاہ کے حملۂ ہند کے بعد جب سلطنت مغلیہ بے حد کمزور ہو گئی۔ اور نادر شاہ کی تقلید میں احمد شاہ ابدالی نے بھی پنجاب پر پے در پے حملے شروع کر دیئے۔ اور بعہد نظامت نواب زکریا خان جب بیگم پورہ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ تو باغبانپورہ کو بھی حق قرابت ادا کرنے کے لئے پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ باغبانپورہ بھی ایک متمول موضع تھا۔ وہاں کئی پشتوں سے شاہی داروغے چلے آتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کی بے لگام و حریص فوجیں جہاں چار پیسوں کا نام سنتیں۔ پاؤں سر پر رکھ کر دوڑتیں۔ اور جس طرح بھی ہوتا۔ لوٹ کھسوٹ کر واپس آتیں۔ مہر مہنگا کی اولاد سے اُن دنوں دو حقیقی بھائی محلہ خرادیاں لاہور میں آ رہے۔ جب احمد شاہ ابدالی واپس چلا جاتا۔ تو یہ بھی باغبانپورہ میں جاکر آباد ہو جاتے۔ اور جب اس کے آنے کی خبر سنتے۔ تو پھر واپس لاہور آ جاتے ٭

احمد شاہ ابدالی کی متواتر یورشوں۔ لڑائیوں اور خونریزیوں کی وجہ سے بیگم پورہ تو تباہ ہو ہی گیا تھا۔ مگر باغبانپورہ میں بھی کوئی متنفس نہ دن کو چین سے رہ سکتا اور نہ رات کو آرام سے سو سکتا تھا۔ بہت سے لوگ ابدالیوں کے خوف سے تتر بتر ہو گئے تھے۔ کچھ دُور دُور کے مواضعات میں چلے گئے تھے۔ گنتی کے چند گھرانے جو باقی تھے وہ بے بال و پر تھے۔ اور اس مصرعہ کا مصداق ع

رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتے ہیں راہزن کو

حافظ لطیف اللہ | انقلاب زمانہ سے خاندان مہر مہنگا کی مالی حالت روز بروز بہت کمزور ہو گئی۔ اس زمانہ میں سکھوں کی رہزنی اور ڈاکہ زنی ابدالی حملوں سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ جو سکھ ڈاکو مالدار ہو جاتا۔ وہ اپنے گاؤں کے گرد چھوٹا سا قلعہ دگڑھی بنا کر رئیس بن جاتا۔ ایسے ہی ایک رئیس کے پاس حافظ لطیف اللہ موضع رن گڑھ

(متصل اٹاری) میں جاکر ملازم ہو گئے۔ اور اُن کے ملازم ہو کر چلے جانے کی وجہ سے باغبانپورہ میں اور بھی بے رونقی ہو گئی

جب لاہور میں سہ حاکمان نے اپنی اپنی حکومت کے لئے لاہور کے حصے بخرے کر لئے۔ تو شالامار باغ کی طرف کا حصہ لہنا سنگھ احد الحاکم لاہور کو ملا۔ حافظ لطیف اللہ نے اس خیال سے کہ ممکن ہے میرے حقوق آبائی ملوکہ گاؤں باغبانپورہ میں میری غیر حاضری کی وجہ سے بالکل تلف نہ ہو جائیں۔ سکھ سرداروں کی ملازمت ترک کر دی۔ اور قسمت آزمائی کے لئے پھر باغبانپورہ میں آگیا۔

باغبانپورہ کی دوبارہ سرسبزی | اسی تاریخ سے باغبانپورہ کی دوبارہ سرسبزی و آبادی کا دور شروع ہوتا ہے۔ حافظ لطیف اللہ نے مکانات کی مرمت کرائی۔ زمینوں کو صاف کیا اور ابھی اپنی محنت کا پھل نہ پایا تھا۔ کہ سمت ۱۸۹۴ بکری میں دو فرزند حافظ علیم اللہ و حافظ محمد چھوڑ کر اس دُنیا سے کوچ کر گیا۔

حافظ لطیف اللہ (یا لطف اللہ) نے باغبانپورہ کی آبادی کے لئے یہ اذن عام دے دیا تھا۔ کہ جو شخص یہاں آ کر آباد ہو گا۔ ہمارے مکانات اور ہماری عمارتیں موجود ہیں آباد کار جس پر چاہے حسب حیثیت خود قبضہ کر لے۔ وہ اسی کا مال متصور ہو گا مگر فلاں تاریخ کے بعد مکانات کی رعایت نہ رہے گی۔ یہ سن کر بہت سے لوگ واپس آگئے اور بہت سے نئے آباد ہو گئے۔

بموجب تحریر تحقیقات چشتی سنہ ۱۲۸۰ھ میں باغبانپورہ کی آبادی ۲۷۸۴۴ نفوس تھی۔ جن میں ہندو (عورتوں سمیت) صرف ۲۶۳ تھے۔ اور کل گھروں کی تعداد ۸۴۹ تھی۔

موضع شالاباغ ضلع مظفرآباد

شالامار کے نام سے جس قدر باغات لاہور و کشمیر کے علاوہ بھی معلوم ہو سکے ہیں اُن کی کیفیت لکھی جا چکی ہے۔ کشتواڑ کے پہاڑوں میں ایک ندی شالا باغ کے نام سے ہے۔ اُس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ اب دورانِ تحریر کتاب ہذا میں ایک ایسے شالاباغ کا نام سُنا گیا ہے جو ایک موضع کی صورت میں آباد ہے۔ اس کے متعلق جب خط و کتابت کی گئی تو معلوم ہوا۔ کہ تحصیل مظفرآباد (کشمیر) کے ایک موضع کا نام شالا باغ ہے۔ جو شہر مظفرآباد سے بجانب جنوب دریائے جہلم کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی کُل آبادی دو اڑھائی سو کے قریب ہے۔ اور عرصہ دراز سے آباد چلا آتا ہے اس کے ارد گرد پہاڑ ہیں۔ یہاں پہونچنے کے لئے رستہ بھی پہاڑی ہے۔ لیکن خود یہ موضع ایک میدان مرتفع میں واقع ہے +

تاریخ حریتِ اسلام

اس نادر الوجود اسلامی تاریخ میں اسلامی جانبازوں اور حریت پسندوں کے جرأت آفرین حق آموز صداقت۔ ثابت قدمی اور اسلامی ادب و اخلاق کے واقعات مہیا کرنے میں جس محنت و عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے۔ مولٰنا عبد الباری فرنگی محل لکھنؤ۔ آغا محمد صفدر بی۔ اے۔ ڈاکٹر کچلو بیرسٹرایٹ لا۔ خانبہادر سید اکبر حسین سشن جج الٰہ آباد حضرت خواجہ حسن نظامی خانبہادر شیخ عبد القادر بیرسٹر سابق جج ہائیکورٹ۔ ڈاکٹر عبد الغنی صاحب بی۔ اے سابق وزیر خارجہ افغانستان مسٹر حسن محمد حیات رجسٹرار مسلم نیشنل یونیورسٹی اور دیگر نامور اہل الرائے لیڈرانِ قوم نے اس کو اسلامی لٹریچر میں ایک بہترین اضافہ تسلیم کیا۔ اور اسلامی سکولوں کالجوں اور لائبریریوں کیلئے خاص طور پر اس کی سفارش کی ہے۔ اس تاریخ کا مطالعہ ارادوں میں حرکت اور حرکت میں جوش و استقلال پیدا کرتا ہے اور بتاتا ہے۔ کہ ہمارے بزرگ حق پرستی اور ایثار و قربانی پاکیزہ نفسی اور راست گوئی میں کسقدر جرأت ایمانی سے کام لیتے تھے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ ہم دنیا میں جب قابلِ عزت تھے۔ جب ہمارا پرچم دنیا کے ہر حصہ پر لہراتا تھا۔ اور جب ہماری سطوت و شوکت سے شاہانِ عالم کانپتے تھے اس وقت ہم میں کونسی خصوصیت تھی۔ اور آج ہماری ذلت و پستی کی کیا وجوہات ہیں حریت اسلام میں زمانہ رسالت عہد خلافت راشدہ و خلفائے بنی اُمیہ و عباسیہ عہد بنی بویہ سلجوقیہ دولت ہسپانیہ و غزنویہ کے علاوہ ٹرکی و مصر الجزائر و مراکش۔ فرمانروایانِ ہند (خاندانِ افاغنہ و غلامان و عہد مغلیہ وغیرہ) اور سلطان بادشاہان دکن و سندھ۔ گجرات۔ کشمیر کے عہدہائے گذشتہ کے راستباز۔ حق گو۔ حق پرست بزرگوں کے حیرت خیز جرأت آفرین اور ولولہ انگیز استقلال اور جوش و آثار کے حریت آموز حالات اور عدل و انصاف حریت و مساوات خدا ترسی و پاکیزہ نفسی کے حامی بادشاہوں کے سبق آموز واقعات کے علاوہ پرستارانِ حق و صداقت اور فدائے مذہب و ملت وعورتوں کے سوانحات عمدہ درج ہیں۔ قیمت .. .. ۳ روپے

حجم زائد از چار سو صفحہ ٭

المشتہر:۔

ظفر برادرس تاجرانِ کتب حلقہ ۲۶ — لاہور